بدلی جاسکتی ہے۔

اس آیت میں اسی مضمون کا بیان اس طرح کیا گیا کہ کتاب تقدیر میں لکھی ہوئی عمر یا رزق یا مصیبت یا راحت وغیرہ میں جو تغیر و تبدل کسی عمل یا دعاء کی وجہ سے ہوتا ہے، اس سے مراد وہ کتاب تقدیر ہے جو فرشتوں کے ہاتھ یا ان کے علم میں ہے اس میں بعض اوقات کوئی حکم کسی خاص شرط پر معلق ہوتا ہے، جب وہ شرط نہ پائی جائے تو یہ حکم بھی نہیں رہتا، اور پھر یہ شرط بعض اوقات تو تحریر میں لکھی ہوئی فرشتوں کے علم میں ہوتی ہے، بعض اوقات لکھی نہیں ہوتی، صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتی ہے، جب وہ حکم بدلا جاتا ہے تو سب حیرت میں رہ جاتے ہیں، اس طرح کی تقدیر معلق کہلاتی ہے، جس میں اس آیت کی تصریح کے مطابق محو و اثبات ہوتا رہتا ہے، لیکن آیت کے آخری جملہ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ نے بتلا دیا کہ اس تقدیر معلق کے اوپر ایک تقدیر مبرم ہے، جو اُمّ الکتاب میں لکھی ہوئی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہ صرف علم الٰہی کے لئے مخصوص ہے، اس میں وہ احکام لکھے جاتے ہیں جو شرائط اعمال یا دعاء کے بعد آخری نتیجہ کے طور پر ہوتے ہیں، اسی لئے وہ محو و اثبات اور کمی بیشی سے بالکل بری ہے (ابن کثیر)

فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ، اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے اور مطمئن رکھنے کے لئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے آپ سے کئے ہیں کہ اسلام کی مکمل فتح ہوگی، اور کفر و کافر ذلیل و خوار ہوں گے، یہ تو ہو کر رہے گا، مگر آپ اس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ فتح مکمل کب ہوگی، ممکن ہے کہ آپ کی زندگی میں ہو جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وفات کے بعد ہو، اور آپ کے اطمینان کے لئے تو یہ بھی کافی ہے کہ آپ برابر دیکھ رہے ہیں کہ ہم کفار کی زمینوں کو ان کے اطراف سے گھٹاتے چلے جاتے ہیں، یعنی یہ اطراف مسلمانوں کے قبضہ میں آجاتے ہیں، اس طرح ان کی مقبوضہ زمین گھٹتی جاتی ہے، اور مسلمانوں کے لئے کشائش ہوتی جاتی ہے، اس طرح ایک دن اس فتح کی تکمیل بھی ہو جائے گی، حکم اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اس کے حکم کو کوئی ٹالنے والا نہیں، وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

سورۂ رعد تمام شد

سُوْرَةُ اِبْرَاهِيْم

سُوْرَةُ اِبْرَاهِيْمَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِثْنَتَانِ وَخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ	
سورۂ ابراہیم مکہ میں اتری اور اس کی باون آیتیں ہیں اور سات رکوع	
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	
شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے	
الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ	
یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے اتاری تیری طرف کہ تو نکالے لوگوں کو اندھیروں سے	
اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۱ اللّٰهِ	
اجالے کی طرف ان کے رب کے حکم سے رستہ پر اس زبردست خوبیوں والے اللہ کے	
الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ	
جس کا ہے جو کچھ کہ موجود ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں اور مصیبت ہے کافروں کو	
مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِۨ ۝۲ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا	
ایک سخت عذاب سے جو کہ پسند رکھتے ہیں زندگی دنیا کی	
عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ	
آخرت سے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور تلاش کرتے ہیں اس میں کجی	
اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝۳	
وہ راستہ بھول کر جا پڑے ہیں دور۔	

خلاصۂ تفسیر

الٓرٰ، (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر نازل فرمایا ہے تاکہ آپ (اس کے ذریعہ سے) تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے (مرتبۂ تبلیغ میں کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان و ہدایت کی) روشنی کی طرف یعنی ذات غالب ستودہ صفات کی راہ کی طرف لاویں (روشنی میں لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ راہ بتلاویں) جو ایسا خدا ہے کہ اس کی ملک ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے اور (جب یہ کتاب خدا کا راستہ بتلاتی ہو تو) بڑی خرابی یعنی بڑا سخت عذاب ہے ان کافروں کو جو (اس راہ کو نہ تو خود قبول کرتے ہیں بلکہ) دنیوی زندگانی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں (اس لئے دین کی جستجو نہیں کرتے) اور (نہ دوسروں کو یہ راہ اختیار کرنے دیتے ہیں بلکہ) اللہ کی (اس) راہ (مذکور) سے روکتے ہیں اور اس میں بھی (یعنی شبہات) کے متلاشی رہتے ہیں (جن کے ذریعہ سے دوسروں کو گمراہ کر سکیں) ایسے لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں (یعنی وہ گمراہی حق سے بڑی دور ہے)۔

معارف و مسائل

سورۃ اور اس کے مضامین | یہ قرآن کریم کی چودھویں سورۃ سورۂ ابراہیم شروع ہوتی ہے یہ سورۃ مکی ہے، قبل از ہجرت نازل ہوئی، بجز چند آیات کے جن کے بارے میں اختلاف ہے کہ مدنی ہیں یا مکی۔

اس سورۃ کے شروع میں رسالت و نبوت اور ان کی کچھ خصوصیات کا بیان ہے، پھر توحید کا مضمون اور اس کے شواہد کا ذکر ہے، اسی سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا ہے، اور اسی کی مناسبت سے سورۃ کا نام سورۂ ابراہیم رکھا گیا ہے۔

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ، الٓرٰ، ان حروف مقطعات میں سے ہیں جن کے متعلق بار بار ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس میں اسلم اور بے غبار طریقہ سلفِ صالحین کا ہے کہ اس پر ایمان و یقین رکھیں کہ جو کچھ اس کی مراد ہے وہ حق ہے، لیکن اس کے معانی کی تحقیق و تفتیش کے درپے نہ ہوں۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ میں نحوی ترکیب کے لحاظ سے زیادہ واضح اور صاف بات یہ ہے کہ اس کو لفظ ھٰذَا محذوف کی خبر قرار دی جائے، اور جملہ کے معنی یہ ہوں کہ یہ وہ کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے، اس میں نازل کرنے کی نسبت حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف، اور خطاب کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں دو چیزوں کی طرف اشارہ پایا گیا

ایک یہ کہ یہ کتاب نہایت عظیم المرتبہ ہے، کہ اس کو خود ذاتِ حق تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، دوسرے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عالی مرتبہ ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کو اس کا پہلا مخاطب بنایا ہے۔

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ لفظ ناس عام انسانوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے مراد تمام عالم کے موجودہ اور آئندہ آنے والے انسان ہیں، ظُلُمٰت ظلمۃ کی جمع ہے، جس کے معنی اندھیرے کے معروف و مشہور ہیں، یہاں ظُلُمٰت سے مراد کفر و شرک اور بداعمالیوں کی ظلمت ہے، اور نور سے مراد ایمان کی روشنی ہے، اسی لئے لفظ ظُلُمٰت کو بصیغہ جمع لایا گیا، کیونکہ کفر و شرک کی بہت سی انواع و اقسام ہیں، اسی طرح بُرے اعمال بھی بیشمار ہیں، اور لفظ نُوْر کو بصیغہ مفرد لایا گیا، کیونکہ ایمان اور حق واحد ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ کتاب ہم نے اس لئے آپ کی طرف نازل کی ہے کہ آپ اس کے ذریعہ تمام عالم کے انسانوں کو کفر و شرک اور بُرے کاموں کی اندھیریوں سے نجات دلا کر ایمان اور حق کی روشنی میں لے آئیں اُن کے رب کی اجازت سے، یہاں لفظ رب لانے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عام انسانوں پر یہ انعام کہ اپنی کتاب اور پیغمبر کے ذریعہ اُن کو اندھیریوں سے نجات دلائیں، اس کا سبب اور منشاء بجز اس لطف و مہربانی کے اور کچھ نہیں، جو تمام انسانوں کے خالق و مالک نے اپنی شانِ ربوبیت سے اُن پر مبذول کر رکھی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہ کسی کا کوئی حق لازم ہے نہ کسی کا زور اس پر چلتا ہے۔

ہدایت صرف خدا کا فعل ہے | اس آیت میں اندھیری سے نجات دے کر روشنی میں لانے کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا فعل قرار دیا گیا ہے، حالانکہ ہدایت دینا حقیقت میں حق تعالیٰ ہی کا فعل ہے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ "یعنی آپ باختیارِ خود کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے"، اسی لئے اس آیت میں بِاِذْنِ رَبِّهِمْ کا لفظ بڑھا کر یہ شبہ ختم کر دیا گیا کیونکہ معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ یہ کفر و شرک کی اندھیریوں سے نکال کر ایمان و عمل صالح کی روشنی میں لانا، اگرچہ اصل حقیقت کی رو سے آپ کے ہاتھ میں نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم و اجازت سے آپ کر سکتے ہیں۔

احکام و ہدایات

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام بنی آدم اور نوعِ انسانی کو بُرائیوں کی اندھیریوں سے نکالنے اور روشنی میں لانے کا واحد ذریعہ اور انسان و انسانیت کو دنیا و آخرت کی بربادی اور ہلاکت سے نجات دلانے کا واحد راستہ قرآن کریم ہے،

جتنا جتنا لوگ اس کے قریب آئیں گے، اسی انداز سے ان کو دنیا میں بھی امن وامان اور عافیت و اطمینان نصیب ہوگا اور آخرت میں بھی فلاح و کامیابی حاصل ہوگی، اور جتنا اس سے دور ہونگے اتنا ہی دونوں جہان کی خرابیوں بربادیوں مصیبتوں اور پریشانیوں کے غار میں گریں گے۔

آیت کے الفاظ میں یہ نہیں کھولا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے ذریعہ کس طرح لوگوں کو اندھیریوں سے نجات دے کر روشنی میں لائیں گے، لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ کسی کتاب کے ذریعہ کسی قوم کو درست کرنے کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تعلیمات و ہدایات کو اس قوم میں پھیلایا جائے، اور ان کو اس کا پابند کیا جائے۔

قرآن کریم کی تلاوت بھی مستقل مقصد ہے

مگر قرآن کریم کی ایک مزید خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی تلاوت اور بغیر سمجھے ہوئے اس کے الفاظ کا پڑھنا بھی بالخاصہ انسان کے نفس پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس کو برائیوں سے بچنے میں مدد دیتا ہے، کم از کم کفر و شرک کے کیسے ہی خوب صورت جال ہوں قرآن پڑھنے والا اگرچہ بے سمجھے ہی پڑھتا ہو، ان کے دام میں نہیں آسکتا، ہندوؤں کی تحریک شدھی سنگٹھن کے زمانے میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے، کہ ان کے دام میں صرف کچھ وہ لوگ آئے جو قرآن کی تلاوت سے بھی بیگانہ تھے، آج عیسائی مشنریاں مسلمانوں کے ہر خطہ میں طرح طرح کے سبز باغ اور سنہرے جال لئے پھرتی ہیں، لیکن ان کا اگر کوئی اثر پڑتا ہے تو صرف اُن گھرانوں پر جو قرآن کی تلاوت سے بھی غافل ہیں، خواہ جاہل ہونے کی وجہ سے یا نئی تعلیم کے غلط اثر سے۔

شاید اسی معنوی اثر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن کریم میں جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد بتلائے گئے ہیں وہاں تعلیم معانی سے پہلے تلاوت کا جداگانہ ذکر کیا گیا ہے: يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین کاموں کے لئے بھیجا گیا ہے، پہلا کام قرآن مجید کی تلاوت ہے، اور ظاہر ہے کہ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے، معانی سمجھے جاتے ہیں ان کی تلاوت نہیں ہوتی، دوسرا کام لوگوں کو برائیوں سے پاک کرنا، اور تیسرا کام قرآن کریم اور حکمت یعنی سنت رسول کی تعلیم دینا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم ایک ایسا ہدایت نامہ ہے جس کے معانی سمجھ کر اس پر عمل کرنا تو اصل مقصد ہی ہے، اور اس کا انسانی زندگی کی اصلاح میں مؤثر ہونا بھی واضح ہے، اس کے ساتھ اس کے الفاظ کی تلاوت کرنا بھی غیر شعوری طور پر انسان کے نفس کی اصلاح میں نمایاں اثر رکھتا ہے۔

اس آیت میں باذنِ خداوندی اندھیریوں سے نکال کر روشنی میں لانے کی نسبت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرکے یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ اگرچہ ہدایت کا پیدا کرنا حقیقۃً حق تعالیٰ کا فعل ہے مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کے بغیر اس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا، قرآن کریم

کا مفہوم اور تعبیر بھی وہی معتبر ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول یا عمل سے بتلا دی ہو اس کے خلاف کوئی تعبیر معتبر نہیں۔

اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

اس آیت کے شروع میں جو ظلمت و نور کا ذکر آیا ہے ظاہر ہے کہ یہ وہ اندھیری اور روشنی نہیں جو عام آنکھوں سے نظر آتے، اس لئے اس کو واضح کرنے کے لئے اس جملے میں ارشاد فرمایا کہ وہ روشنی اللہ کا راستہ ہے جس پر گامزن ہونے والا نہ اندھیرے میں چلنے والے کی طرح بھٹکتا ہے، نہ اس کو لغزش ہوتی ہے، نہ وہ مقصد تک پہونچنے میں ناکام ہوتا ہے، اللہ کے راستہ سے مراد وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان خدا تک پہونچ سکے، اور اس کی رضا کا درجہ حاصل کر سکے۔

اس جگہ لفظ اللہ تو بعد میں لایا گیا، اس سے پہلے اس کی دو صفتیں عزیز اور حمید ذکر کی گئی ہیں، عزیز کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے قوی اور غالب کے ہیں، اور حمید کے معنی وہ ذات جو حمد کی مستحق ہو، ان دو صفتوں کو اصل نام حق سے پہلے لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ راستہ جس ذاتِ قدوس کی طرف لے جانے والا ہے وہ قوی اور غالب بھی ہے اور ہر حمد کی مستحق بھی، اس لئے اس پر چلنے والا نہ کہیں ٹھوکر کھائے گا نہ اس کی کوشش رائگاں ہوگی بلکہ اس کا منزلِ مقصود پہ پہونچنا یقینی ہے شرط یہ ہے کہ اس راستہ کو نہ چھوڑے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ دو صفتیں پہلے بیان کرنے کے بعد فرمایا اَللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، یعنی یہ وہ ذات ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اسی کا پیدا کیا ہوا اور اسی کی ملک خاص ہے جس میں کوئی شریک نہیں۔

وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ، لفظ وَیل عذاب شدید اور ہلاکت کے معنی میں آتا ہے، معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اس نعمتِ قرآن سے منکر ہیں اور کفر و شرک کے اندھیرے ہی میں رہنے کو پسند کرتے ہیں، ان کے لئے بڑی بربادی اور ہلاکت ہے اس عذاب شدید سے جو اُن پر آنے والا ہے۔

خلاصۂ مفہوم آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ سب انسانوں کو اندھیرے سے نکال کر اللہ کے راستہ کی روشنی میں لے آئے، مگر جو بدنصیب قرآن ہی کے منکر ہو جائیں تو وہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو عذاب میں ڈال رہے ہیں، جو لوگ قرآن کے کلام الٰہی ہونے ہی کے منکر ہیں وہ تو اس وعید کی مراد ہیں ہی، مگر جو اعتقاداً منکر نہیں مگر عملاً قرآن کو چھوڑے ہوئے ہیں، نہ تلاوت سے کوئی واسطہ ہے نہ اس کے سمجھنے اور عمل کرنے کی طرف کوئی التفات ہو وہ بدنصیب بھی مسلمان ہونے کے باوجود اس وعید سے بالکل بری نہیں۔

الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝ اس آیت میں منکرین قرآن کافروں کے تین حال بتلائے گئے ہیں، ایک یہ کہ وہ دنیا کی زندگی کو بہ نسبت آخرت کے زیادہ پسند کرتے ہیں، اور ترجیح دیتے ہیں، اسی لئے دنیا کے نفع یا آرام کی خاطر آخرت کا نقصان کرنا گوارا کر لیتے ہیں، اس میں ان کے مرض کی تشخیص کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ لوگ قرآن کریم کے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود اس سے منکر کیوں ہیں، وجہ یہ ہے کہ ان کو دنیا کی موجودہ زندگی کی محبت نے آخرت کے معاملات سے اندھا کر رکھا ہے، اس لئے ان کو اپنی اندھیری ہی پسند ہے، روشنی کی طرف آنے سے کوئی رغبت نہیں۔

دوسری خصلت ان کی یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ خود تو اندھیریوں میں رہنے کو پسند کرتے ہی ہیں اس پر ظلم یہ ہے کہ وہ اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے دوسروں کو بھی روشنی کی شاہراہ یعنی اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔

قرآن فہمی میں بعض غلطیوں کی نشاندہی

تیسری خصلت يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا میں بیان کی گئی ہے، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ یہ لوگ اپنی بد باطنی اور بد عملی کے سبب اس فکر میں لگے رہتے ہیں، کہ اللہ کے روشن اور سیدھے راستہ میں کوئی کجی اور خرابی نظر آئے تو ان کو اعتراض اور طعن کا موقع ملے، ابن کثیر نے یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔

اور اس جملہ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اللہ کے راستے یعنی قرآن و سنت میں کوئی چیز ان کے خیالات اور خواہشات کے موافق مل جائے، تو اس کو اپنی حقانیت کے استدلال میں پیش کریں، تفسیر قرطبی میں اسی معنی کو اختیار کیا گیا ہے، جیسے آجکل بے شمار اہل علم اس میں مبتلا ہیں کہ اپنے دل میں ایک خیال کبھی اپنی غلطی سے کبھی کسی دوسری قوم سے متاثر ہو کر گھڑ لیتے ہیں، پھر قرآن و حدیث میں اس کے مؤیدات تلاش کرتے ہیں، اور کہیں کوئی لفظ اس خیال کی موافقت میں نظر پڑ گیا تو اس کو اپنے حق میں قرآنی دلیل سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ طریقہ کار اصولاً ہی غلط ہے کیونکہ مؤمن کا کام یہ ہے کہ اپنے خیالات و خواہشات سے خالی الذہن ہو کر کتاب و سنت کو دیکھے، جو کچھ ان سے واضح طور پر ثابت ہو جائے اسی کو اپنا مسلک قرار دے۔

اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ، اس جملہ میں ان کفار کا انجام بد بیان کیا گیا ہے جن کی تین صفتیں اوپر بیان ہوئی ہیں، اور حاصل اس کا یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی گمراہی میں بڑی دور جا پہنچے ہیں، کہ اب ان کا راہ پر آنا مشکل ہے۔

احکام و مسائل

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اگرچہ اس آیت میں صراحۃً یہ تین خصلتیں کفار کی بیان کی گئی ہیں، اور انہی کا یہ انجام ذکر کیا گیا ہے کہ وہ گمراہی میں دور جا پڑے ہیں، لیکن اصول کی رُو سے جس مسلمان میں بھی یہ تین خصلتیں موجود ہوں وہ بھی اس وعید کا مستحق ہو، ان تین خصلتوں کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) دنیا کی محبت کو آخرت پر غالب رکھیں، یہاں تک کہ دین کی روشنی میں نہ آئیں۔

(۲) دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک رکھنے کے لئے اللہ کے راستہ سے روکیں۔

(۳) قرآن و سنت کو میر بھیر کر کے اپنے خیالات پر منطبق کرنے کی کوشش کریں۔ نعوذ باللہ منہ

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ

اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر بولی بولنے والا اپنی قوم کی تاکہ انکو سمجھائے پھر راستہ بھلاتا ہے اللہ

مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۴

جس کو چاہے اور راستہ دکھلا دیتا ہے جس کو چاہے اور وہ ہے زبردست حکمتوں والا۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں جو بعض کفار کو یہ شبہ ہے کہ یہ عربی کیوں ہے جس سے احتمال ہوتا ہے کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تصنیف کر لیا ہوگا، عجمی زبان میں کیوں نہیں تاکہ یہ احتمال ہی نہ ہوتا، اور قرآن دوسری کتب سماویہ سے عجمی ہونے میں متوافق بھی ہوتا تو یہ شبہ محض لغو ہے کیونکہ) ہم نے تمام (پہلے) پیغمبروں کو (بھی) انہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، تاکہ (ان کی زبان میں) ان سے (احکام الٰہیہ کو) بیان کریں (کہ اصل مقصود واضح بیان ہے، تو سب کتابوں کا ایک زبان میں ہونا کوئی مقصد نہیں) پھر (بیان کرنے کے بعد) جس کو اللہ تعالیٰ چاہے گمراہ کرتے ہیں (کہ وہ ان احکام کو قبول نہیں کرتا) اور جس کو چاہیں ہدایت کرتے ہیں (کہ وہ ان احکام کو قبول کر لیتا ہے) اور وہی (سب امور پر) غالب ہے (اور) حکمت والا ہے (کہ غالب ہونے کے سبب سب کو ہدایت کر سکتا تھا، مگر بہت سی حکمتیں اس کو مقتضی نہ ہوئیں)۔

معارف ومسائل

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت اور سہولت کا ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بھی کوئی رسول کسی قوم کی طرف بھیجا ہے تو اس قوم کا ہمزبان بھیجا ہے، تاکہ وہ احکامِ الٰہیہ انہی کی زبان اور انہی کے محاورات میں بتلائے اور ان کو اس کا سمجھنا آسان ہو اگر رسول کی زبان امت کی زبان سے مختلف ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس کے احکام سمجھنے میں امت کو ترجمہ کرنے کرانے کی مشقت بھی اٹھانا پڑتی، اور پھر بھی احکام کو صحیح سمجھنا مشکوک رہتا، اس لئے اگر عبرانی زبان بولنے والوں کی طرف کوئی رسول بھیجا تو رسول کی زبان بھی عبرانی ہی تھی، فارسیوں کے رسول کی زبان بھی فارسی، بربریوں کے رسول کی زبان بربری رکھی گئی، خواہ اس صورت سے کہ جس شخص کو رسول بنایا گیا وہ خود اسی قوم کا فرد ہو اور مادری زبان اسی قوم کی زبان ہو یا یہ کہ اس کی پیدائشی اور مادری زبان اگرچہ کچھ اور ہو مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرمائے کہ اس نے اس قوم کی زبان سیکھ لی، جیسے حضرت لوط علیہ السلام اگرچہ اصل باشندے عراق کے تھے، جہاں کی زبان فارسی تھی، لیکن ملکِ شام کی طرف ہجرت کرنے کے بعد انہی لوگوں میں شادی کی اور شامیوں کی زبان ہی ان کی زبان بن گئی، تب اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خطۂ شام کا نبی بنایا۔

اور ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت مکان ومقام کے اعتبار سے پوری دنیا کے لئے اور زمانے کے اعتبار سے قیامت تک کے لئے عام ہے دنیا کی کوئی قوم کسی ملک کی رہنے والی، کسی زبان کی بولنے والی آپ کے دائرۂ رسالت ونبوت سے باہر نہیں، اور قیامت تک جتنی قومیں اور زبانیں نئی پیدا ہوں گی، وہ بھی سب کی سب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت میں داخل ہوں گی، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے، يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا، "یعنی اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف" اور صحیح بخاری ومسلم میں بروایت جابرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء کے درمیان اپنی پانچ امتیازی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھ سے پہلے ہر رسول و نبی خاص اپنی قوم وبرادری کی طرف مبعوث ہوا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام اقوامِ بنی آدم کی طرف مبعوث فرمایا ہو۔

حق تعالیٰ نے اس عالم میں انسانی آبادی کو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع فرمایا، اور انہی کو انسانوں کا سب سے پہلا نبی اور پیغمبر بنایا، پھر انسانی آبادی جس طرح اپنی عمرانی

اور اقتصادی حیثیت سے پھیلتی اور ترقی کرتی رہی، اسی کی مناسبت سے رشد وہدایت کے انتظامات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف رسولوں پیغمبروں کے ذریعہ ہوتے رہے، زمانہ کے ہر دور اور ہر قوم کے مناسب حال احکام اور شریعتیں نازل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ عالم انسانی کا نشوونما سنِ کمال کو پہونچا تو اللہ تعالیٰ نے سید الاولین والآخرین امام الانبیاء محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس پوری دنیا کا رسول بنا کر بھیجا اور جو کتاب وشریعت آپ کو دی وہ پورے عالم اور قیامت تک کے پورے زمانے کے لئے کامل ومکمل کر کے دی، اور ارشاد فرمایا، اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ، "یعنی میں نے آج تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت تمہارے لئے پوری کر دی"۔

پچھلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں بھی اپنے وقت اور اپنے خطے کے اعتبار سے کامل مکمل تھیں، ان کو بھی ناقص نہیں کہا جا سکتا، لیکن شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا کمال کسی خاص وقت اور خاص خطے کے ساتھ مخصوص نہیں، یہ کامل علی الاطلاق ہے، اسی حیثیت سے تکمیلِ دین اس شریعت کے ساتھ مخصوص ہے، اور اسی وجہ سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا۔

قرآن کریم عربی زبان میں کیوں ہو یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح پچھلی امتوں کے رسول ان کے ہمزبان بھیجے گئے ان کو ترجمہ کرنے کی محنت کی ضرورت نہ رہی، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف عرب میں عربی زبان کے ساتھ کیوں مبعوث ہوئے؟ اور آپ کی کتاب قرآن بھی عربی زبان ہی میں کیوں نازل ہوئی، لیکن غور وفکر سے کام لیا جائے تو جواب صاف ہے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت تمام اقوام دنیا کے لئے عام ہوئی جن میں سیکڑوں زبانیں رائج ہیں تو ان سب کی ہدایت کے لئے دو ہی صورتیں ممکن تھیں، ایک یہ کہ قرآن ہر قوم کی زبان میں جدا جدا نازل ہوتا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وہدایات بھی ہر قوم کی زبان میں جدا جدا ہوتیں، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے سامنے اس کا انتظام کوئی دشوار نہ تھا، لیکن تمام اقوامِ عالم کے لئے ایک رسول ایک کتاب ایک شریعت بھیجنے کا جو ایک عظیم مقصد ان تمام اقوامِ عالم میں ہزاروں طرح کے اختلافات کے باوجود دینی، اخلاقی، معاشرتی وحدت اور یکجہتی پیدا کرنا ہے، وہ اس صورت سے حاصل نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ جب ہر قوم ہر ملک کا قرآن وحدیث الگ زبان میں ہوتے تو اس میں تحریفِ قرآن کے بے شمار راستے کھل جاتے، اور قرآن کریم کے کلام کا محفوظ ہونا جو اس کی ایسی خصوصیت ہے کہ اغیار اور منکرینِ قرآن بھی اس کے تسلیم کرنے سے گریز نہیں کر سکتے یہ معجزانہ

خصوصیت قائم نہ رہتی، اور ایک ہی دین ایک ہی کتاب کے ہوتے ہوئے اس کے ماننے والوں کی اتنی مختلف رائیں ہو جائیں کہ کوئی نقطۂ وحدت ہی باقی نہ رہتا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کے ایک عربی زبان میں نازل ہونے کے باوجود اس کی تعبیر و تفسیر میں کس قدر اختلافات جائز حدود میں پیش آئے، اور ناجائز و باطل طریقوں سے اختلاف کی تو کوئی حد نہیں، لیکن ان سب کے باوجود مسلمانوں کی قومی وحدت اور ممتاز تشخص ان سب لوگوں میں موجود ہے، جو قرآن پر کسی درجہ میں بھی عامل ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و بعثت کا پوری اقوامِ دنیا کے لئے عام ہونے کی صورت میں ان سب کی تعلیم و ہدایت کی یہ صورت کہ قرآن ہر قوم کی زبان میں الگ الگ ہوتا اس کو تو کوئی ادنیٰ سمجھ کا آدمی بھی درست نہیں سمجھ سکتا، اس لئے ضروری ہوا کہ قرآن کسی ایک ہی زبان میں آئے اور رسول کی زبان بھی وہی قرآن کی زبان ہو، پھر دوسری ملکی اور علاقائی زبانوں میں اس کے ترجمے پہونچائے اور پھیلائے جائیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب علماء ہر قوم ہر ملک میں آپ کی دی ہوئی ہدایات کو اپنی اپنی قوم و ملک کی زبان میں سمجھائیں اور شائع کریں، اس کے لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے تمام دنیا کی زبانوں میں سے عربی زبان کا انتخاب فرمایا جس کی بہت سی وجوہ ہیں۔

عربی کی خصوصیات اوّل یہ کہ عربی زبان آسمان کی دفتری زبان ہے، فرشتوں کی زبان عربی ہے، لوحِ محفوظ کی زبان عربی ہے جیسا کہ آیت قرآن بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ سے معلوم ہوتا ہے، اور جنّت، جو انسان کا وطنِ اصلی ہے اور جہاں اس کو لوٹ کر جانا ہو اس کی زبان بھی عربی ہے، طبرانی، مستدرک حاکم، شعب الایمان بیہقی میں بروایت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ لِاَنِّيْ عَرَبِيٌّ وَالْقُرْاٰنُ عَرَبِيٌّ وَكَلَامُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ، (اس روایت کو حاکم نے مستدرک میں صحیح کہا ہے، جامع صغیر میں بھی صحیح کی علامت بتائی ہے، بعض محدثین نے اس کو ضعیف و مجروح کہا ہے) حافظ حدیث ابن تیمیہؒ نے کہا ہے کہ مضمون اس حدیث کا ثابت ہے درجۂ حسن سے کم نہیں، (فیض القدیر شرح جامع صغیر، ص ۹، ج ۱)

معنی حدیث کے یہ ہیں کہ تم لوگ تین وجہ سے عرب سے محبت کرو، ایک یہ کہ میں عربی ہوں، دوسرے یہ کہ قرآن عربی ہے، تیسرے یہ کہ اہلِ جنت کی زبان عربی ہے۔"

تفسیر قرطبی وغیرہ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زبان جنت میں عربی تھی، زمین پر نازل ہونے اور توبہ قبول ہونے کے بعد عربی ہی زبان میں کچھ تغیر ہو کر سریانی زبان پیدا ہو گئی

اس سے اُن روایات کی بھی تائید و تقویت ہوتی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ سے منقول ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کی اصلی زبان عربی ہی تھی، جبرئیل امین نے قومی زبان میں ترجمہ کر کے پیغمبروں کو بتلایا اور انھوں نے اپنی قومی زبان میں امتوں کو پہونچایا، یہ روایات علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں اور آیت مذکورہ کے ذیل میں اکثر مفسرین نے نقل کی ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب آسمانی کتابوں کی اصل زبان عربی ہے، مگر قرآن کریم کے سوا دوسری کتابیں ملکی اور قومی زبانوں میں ترجمہ کر کے دی گئی ہیں، اس لئے ان کے معانی تو سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں مگر الفاظ بدلے ہوئے ہیں، یہ صرف قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس کے معانی کی طرح الفاظ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے آئے ہوئے ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے یہ دعویٰ کیا کہ سارا جہان جن و انس جمع ہو کر بھی قرآن کی ایک چھوٹی سورۃ بلکہ ایک آیت کی مثال نہیں بنا سکتے، کیونکہ وہ معنوی اور لفظی حیثیت سے کلام الٰہی اور ایک صفتِ الٰہی ہے، جس کی کوئی نقل نہیں اتار سکتا، معنوی حیثیت سے تو دوسری آسمانی کتابیں بھی کلام الٰہی ہیں، مگر ان میں شاید اصل عربی الفاظ کے بجائے ترجمہ ہونے ہی کی وجہ سے یہ دعویٰ کسی دوسری آسمانی کتاب نے نہیں کیا، ورنہ قرآن کی طرح کلام الٰہی ہونے کی حیثیت سے ہر کتاب کی یکتائی اور بے مثال ہونا یقینی تھا۔

عربی زبان کے انتخاب کی ایک وجہ خود اس زبان کی ذاتی صلاحیتیں بھی ہیں کہ ایک مفہوم کی ادائیگی کے لئے اس میں بے شمار صورتیں اور طریقے ہیں۔

اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر عربی زبان سے ایک مناسبت عطا فرمائی ہے، جس کی وجہ سے ہر شخص بآسانی عربی زبان بقدرِ ضرورت سیکھ لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام جس ملک میں پہونچے تھوڑے ہی عرصہ میں بغیر کسی جبر و اکراہ کے پورے ملک کی زبان عربی ہو گئی، مصر، شام، عراق سب میں کسی کی زبان بھی عربی نہ تھی، جو آج عربی ممالک کہلاتے ہیں

ایک یہ وجہ بھی ہے کہ عرب لوگ اگرچہ اسلام سے پہلے سخت بداعمالیوں کے شکار تھے، مگر اس قوم کی صلاحیتیں اور ملکات اور جذبات ان حالتوں میں بھی بے نظیر تھے، یہی وجہ تھی کہ حق تعالیٰ نے اپنے سب سے بڑے اور آخری رسول گو ان میں پیدا فرمایا، اور ان کی زبان کو قرآن کے لئے منتخب فرمایا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے انہی کی ہدایت و تعلیم کا حکم دیا وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ، اور سب سے پہلے اسی قوم کے ایسے افراد اپنے رسول کے گرد جمع فرما دیئے، جنھوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان، مال، اولاد سب کچھ قربان کیا اور آپ کی تعلیمات کو جانوں سے زیادہ عزیز سمجھا، اور اس طرح ان پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی صحبت و تعلیم کا وہ گہرا رنگ چڑھا کہ پوری دنیا میں ایک ایسا مثالی معاشرہ پیدا ہوگیا جس کی نظیر اس سے پہلے آسمان و زمین نے نہیں دیکھی تھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بے مثال جماعت کو قرآنی تعلیمات کے پھیلانے اور شائع کرنے کے لئے کھڑا کر دیا اور فرمایا:

بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً، یعنی مجھ سے سنی ہوئی بات کو امت تک پہنچا دو، ان جاں نثار صحابہ نے اس ہدایت کو پلے باندھا، اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچ کر قرآن اور اس کی تعلیمات کو جہان میں پھیلا دیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پچیس سال گذرنے نہ پائے تھے کہ قرآن کی آواز شرق و مغرب میں گونجنے لگی۔

دوسری طرف حق تعالیٰ نے تقدیری اور تکوینی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت جس میں دنیا کے مشرکین اور اہل کتاب یہود و نصاریٰ سب داخل ہیں، ان میں ایک خاص ملکہ اور جذبہ تعلیم و تعلم اور تصنیف و تالیف، تبلیغ و اشاعت کا ایسا پیدا فرما دیا کہ اس کی نظیر دنیا کی پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی، اس کے نتیجہ میں عجمی اقوام میں نہ صرف قرآن و سنت کے علوم حاصل کرنے کا قوی جذبہ پیدا ہوا بلکہ عربی زبان کو حاصل کرنے اور اس کی ترویج و اشاعت میں عجمیوں کا قدم عرب سے پیچھے نہیں رہا۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ اس وقت عربی لغت اور محاورات اور اس کے قواعد نحو و صرف (گرامر) پر جتنی کتابیں دنیا میں موجود ہیں وہ بیشتر عجمیوں کی لکھی ہوئی ہیں، قرآن و سنت کی جمع و تدوین پھر تفسیر و تشریح میں بھی ان کا حصہ عربوں سے کم نہیں رہا۔

اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور آپ کی کتاب عربی ہونے کے باوجود پورے عالم پر محیط ہوگئی، اور دعوت و تبلیغ کی حد تک عرب و عجم کا فرق مٹ گیا، ہر ملک قوم اور ہر عجمی زبان کے لوگوں میں ایسے علماء پیدا ہوگئے جنھوں نے قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنی قومی زبانوں میں نہایت سہولت کے ساتھ پہونچا دیا، اور رسول کو قوم کی زبان میں بھیجنے کی جو حکمت تھی وہ حاصل ہوگئی۔

آخر آیت میں فرمایا کہ ہم نے لوگوں کی سہولت کے لئے اپنے رسولوں کو ان کی زبان میں اس لئے بھیجا کہ وہ ہمارے احکام ان کو اچھی طرح سمجھا دیں، لیکن ہدایت اور گمراہی پھر بھی کسی انسان کے بس میں نہیں، اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے وہ جس کو چاہتے ہیں گمراہی میں رکھتے ہیں جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں، وہی بڑی قوت اور حکمت والے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ

اور بھیجا تھا ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دیکر کہ نکال اپنی قوم کو اندھیروں سے

اِلَى النُّوْرِ ۥ وَذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ

اجالے کی طرف اور یاد دلا ان کو دن اللہ کے، البتہ اس میں نشانیاں ہیں اس کو جو صبر

صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ

کرنے والا ہے شکر گذار، اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو یاد کرو اللہ کا احسان اپنے

عَلَیْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ

اوپر جب چھڑا دیا تم کو فرعون کی قوم سے وہ پہنچاتے تھے تم کو برا عذاب،

وَیُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِیْ ذٰلِكُمْ

اور ذبح کرتے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تمہاری عورتوں کو اور اس میں مدد

بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ۝ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ

ہوئی تمہارے رب کی طرف سے بڑی، اور جب سنا دیا تمہارے رب نے اگر احسان

شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ۝

مانوگے تو اور بھی دوں گا تم کو اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب البتہ سخت ہے،

وَقَالَ مُوْسٰٓی اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۙ

اور کہا موسیٰ نے اگر کفر کروگے تم اور جو لوگ زمین میں ہیں سارے،

فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝

تو اللہ بے پرواہ ہے سب خوبیوں والا۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو (کفر و معاصی کی) تاریکیوں سے (نکال کر ایمان و طاعت کی) روشنی کی طرف لاؤ اور ان کو اللہ تعالیٰ کے معاملات (نعمت اور عذاب کے) یاد دلاؤ بلاشبہ ان معاملات میں عبرتیں ہیں ہر صابر شاکر کے لئے

(کیونکہ نعمت کو یاد کر کے شکر کرے گا اور نقمت یعنی عتاب کو پھر اس کے زوال کو یاد کر کے آئندہ حوادث میں صبر کرے گا) اور اس وقت کو یاد کیجئے کہ جب (ہمارے اس ارشاد بالا کے موافق) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو جب کہ تم کو فرعون والوں سے نجات دی جو تم کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے اور تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (یعنی لڑکیوں کو جو کہ بڑی ہو کر عورتیں ہو جاتی تھیں) زندہ چھوڑ دیتے تھے (تاکہ ان سے کار و خدمت لیں سو یہ بھی مثل ذبح ہی کے ایک عقوبت تھی) اور اس (مصیبت اور نجات دونوں) میں تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑا امتحان ہے (یعنی مصیبت میں بلاء تھی اور نجات میں نعمت تھی اور بلاء اور نعمت دونوں بندے کے لئے امتحان ہیں پس اس میں موسیٰ علیہ السلام نے ایام اللہ یعنی نعمت و نقمت دونوں کی تذکیر فرما دی) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے یہ بھی فرمایا کہ اے میری قوم) وہ وقت یاد کرو جب کہ تمہارے رب نے (میرے ذریعہ سے) تم کو اطلاع فرما دی کہ اگر (میری نعمتوں کو سن کر) تم شکر کرو گے تو تم کو (خواہ دنیا میں بھی یا آخرت میں تو ضرور) زیادہ نعمت دوں گا اور اگر تم (ان نعمتوں کو سنکر) ناشکری کرو گے تو (یہ سمجھ رکھو کہ) میرا عذاب بڑا سخت ہے (ناشکری میں اس کا احتمال ہے) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (یہ بھی) فرمایا کہ اگر تم اور تمام دنیا بھر کے آدمی سب کے سب مل کر بھی ناشکری کرنے لگو تو اللہ تعالیٰ (کا کوئی ضرر نہیں کیونکہ وہ) بالکل بے حتیاج (اور اپنی ذات میں) ستودہ صفات ہیں (ہشمال بالغیر کا وہاں احتمال نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کا ضرر محتمل ہی نہیں اور تم اپنا ضرر سن چکے ہو اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ اس لئے شکر کرنا ناشکری مت کرنا)

معارف و مسائل

پہلی آیت میں مذکور ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات دے کر بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو کفر و معصیت کی تاریکیوں سے ایمان و طاعت کی روشنی میں لے آئیں۔

لفظ آیات سے آیات تورات بھی مراد ہو سکتی ہیں کہ ان کے نازل کرنے کا مقصد ہی حق کی روشنی پھیلانا تھا، اور آیات کے دوسرے معنی معجزات کے بھی آتے ہیں، وہ بھی اس جگہ مراد ہو سکتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نو معجزات خاص طور سے عطا فرمائے تھے جن میں عصا کا سانپ بن جانا اور ہاتھ کا روشن ہو جانا کئی جگہ قرآن میں مذکور ہے، آیات کو معجزات کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسے کھلے ہوئے معجزات دے کر بھیجا گیا جن کو دیکھنے کے بعد کوئی شریف سمجھدار انسان اپنے انکار اور نافرمانی

پر قائم نہیں رہ سکتا۔

ایک نکتہ اس آیت میں لفظ قوم آیا ہے کہ اپنی قوم کو اندھیری سے روشنی میں لائیں، لیکن یہی مضمون اسی سورۃ کی پہلی آیت میں جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے بیان کیا گیا تو وہاں قوم کے بجائے لفظ ناس استعمال کیا گیا، لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ، اس میں اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و بعثت صرف اپنی قوم بنی اسرائیل اور مصری اقوام کی طرف تھی اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام عالم کے انسانوں کے لئے ہے۔

پھر ارشاد فرمایا وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ، یعنی حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی قوم کو ایام اللہ یاد دلاؤ۔

ایام اللہ اَیَّام، یوم کی جمع ہے، جس کے معنی دن کے مشہور ہیں، لفظ اَیّام اللہ دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے، اور وہ دونوں یہاں مراد ہو سکتے ہیں، اوّل وہ خاص ایام جن میں کوئی جنگ یا انقلاب آیا ہے، جیسے غزوۂ بدر و اُحد اور احزاب و حُنین وغیرہ کے واقعات، یا پچھلی امتوں پر عذاب نازل ہونے کے واقعات ہیں، جن میں بڑی بڑی قومیں زیر و زبر یا نیست و نابود ہو گئیں، اس صورت میں اَیّام اللہ یاد دلانے سے ان قوموں کو کفر کے انجام بد سے ڈرانا اور متنبہ کرنا مقصود ہوگا۔

دوسرے معنی اَیّام اللہ کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کے بھی آتے ہیں تو ان کو یاد دلانے کا مقصد یہ ہوگا کہ شریف انسان کو جب کسی محسن کا احسان یاد دلایا جائے تو وہ اس کی مخالفت اور نافرمانی سے شرما جاتا ہے۔

قرآن مجید کا اسلوب اور طریق اصلاح عموماً یہ ہے کہ جب کوئی حکم دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس حکم پر عمل آسان کرنے کی تدبیریں بھی بتلائی جاتی ہیں، یہاں پہلے جملہ میں موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی آیات سنا کر یا معجزات دکھا کر اپنی قوم کو کفر کی اندھیری سے نکالو، اور ایمان کی روشنی میں لاؤ، اس کی تدبیر اس جملہ میں یہ ارشاد فرمائی کہ نافرمانوں کو راہِ راست پر لانے کی دو تدبیریں ہیں، ایک سزا سے ڈرانا، دوسرے نعمتوں اور احسانات کو یاد دلا کر اطاعت کی طرف بلانا، جملہ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ میں یہ دونوں چیزیں مراد ہو سکتی ہیں کہ پچھلی امتوں کے نافرمانوں کا انجامِ بد ان پر آنے والے عذاب اور جہاد میں ان کا مقتول یا ذلیل و خوار ہونا ان کو یاد دلائیں، تاکہ وہ عبرت حاصل کر کے اس سے بچ جائیں، اسی طرح اس قوم پر جو اللہ تعالیٰ کی عام نعمتیں دن رات برستی ہیں اور جو مخصوص نعمتیں ہر موقع پر ان کے لئے

مبذول ہوتی ہیں، مثلاً وادی تیہ میں ان کے سروں پر ابر کا سایہ، خوراک کے لئے مَنّ وسلویٰ کا نزول پانی کی ضرورت ہوئی تو پتھر سے چشموں کا بہہ نکلنا وغیرہ ان کو یاد دلا کر خدا تعالیٰ کی اطاعت اور توحید کی طرف بلایا جائے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ اس میں آیات سے مراد نشانیاں اور دلائل ہیں، اور صَبّار صبر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت صبر کرنے والا اور شکور شکر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت شکر گذار، جملہ کے معنی یہ ہیں کہ اَیّامِ اللہ یعنی پچھلے واقعات خواہ وہ جو منکروں کی سزا اور عذاب سے متعلق ہوں یا اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات سے متعلق بہرحال ماضی کے واقعات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی بڑی نشانیاں اور دلائل موجود ہیں اس شخص کے لئے جو بہت صبر کرنے والا اور بہت شکر کرنے والا ہو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ کھلی ہوئی نشانیاں اور دلائل اگرچہ ہر غور کرنے والے کی ہدایت کے لئے ہیں مگر بدنصیب کفار ان میں غور و فکر ہی نہیں کرتے ان سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے، فائدہ صرف وہ لوگ اٹھاتے ہیں، جو صبر و شکر کے جامع ہیں، مراد اس سے مؤمن ہیں، کیونکہ بیہقی نے بروایت انسؓ نقل کیا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان کے دو حصے ہیں آدھا صبر اور آدھا شکر (مظہری)

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ صبر نصف ایمان ہے، اور صحیح مسلم اور مسند احمد میں بروایت حضرت صہیبؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن کا ہر حال خیر ہی خیر اور بھلائی ہی بھلا ہے، اور یہ بات سوائے مؤمن کے اور کسی کو نصیب نہیں، کیونکہ مؤمن کو اگر کوئی راحت، نعمت یا عزت ملتی ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوتا ہے جو اس کے لئے دین و دنیا میں خیر اور بھلائی کا سامان ہو جاتا ہے (دنیا میں تو حسبِ وعدۂ الٰہی نعمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، اور قائم رہتی ہے، اور آخرت میں اس کے شکر کا اجر عظیم اس کو ملتا ہے) اور اگر مؤمن کو کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آجائے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اس کے صبر کی وجہ سے وہ مصیبت بھی اس کے لئے نعمت و راحت کا سامان ہو جاتی ہے (دنیا میں اس طرح کہ صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے، قرآن کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ، اور اللہ جس کے ساتھ ہو انجام کار اس کی مصیبت راحت سے تبدیل ہو جاتی ہے، اور آخرت میں اس طرح کہ صبر کا اجر عظیم اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے حساب ہے، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝،

خلاصہ یہ ہے کہ مؤمن کا کوئی حال بُرا نہیں ہوتا، اچھا ہی اچھا ہے، وہ گرنے میں بھی

اُبھرتا ہے اور بگڑنے میں بھی بنتا ہے، ؎

نہ شوخی چل سکی بادِ صبا کی،
بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

ایمان وہ دولت ہے جو مصیبت و تکلیف کو بھی راحت و نعمت میں تبدیل کر دیتی ہے۔

حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ میں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں آپ کے بعد ایک ایسی اُمت پیدا کرنے والا ہوں کہ اگر ان کی دلی مراد پوری ہو اور کام حسبِ منشاء ہو جائے تو وہ شکر ادا کریں گے، اور اگر ان کی خواہش اور مرضی کے خلاف ناگوار اور ناپسندیدہ صورتِ حال پیش آئے تو وہ اس کو ذریعۂ ثواب سمجھ کر صبر کریں گے اور یہ دانشمندی اور بردباری ان کی اپنی ذاتی عقل و حلم کا نتیجہ نہیں، بلکہ ہم ان کو اپنے علم و حلم کا ایک حصہ عطا فرما دیں گے (مظہری)

شکر کی حقیقت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور حرام و ناجائز کاموں میں خرچ نہ کرے اور زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اپنے افعال و اعمال کو بھی اس کی مرضی کے مطابق بنائے۔

اور صبر کا خلاصہ یہ ہے کہ خلافِ طبع امور پر پریشان نہ ہو، اپنے قول و عمل میں ناشکری سے بچے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دنیا میں بھی امیدوار رہے اور آخرت میں صبر کے اجرِ عظیم کا یقین رکھے۔

دوسری آیت میں مضمون سابق کی مزید تفصیل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی یہ خاص نعمت یاد دلائیں کہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے فرعون نے ان کو ناجائز طور پر غلام بنایا ہوا تھا، اور پھر ان غلاموں کے ساتھ بھی انسانیت کا سلوک نہ تھا، ان کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جاتا تھا، اور صرف لڑکیوں کو اپنی خدمت کے لئے پالا جاتا تھا؛ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس فرعونی عذاب سے نجات دیدی۔

شکر اور ناشکری کے نتائج

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ۝ لفظ تاذن، اذن اور اطلاع دینے اور اعلان کرنے کے معنی میں ہو، مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ بات یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان عام فرما دیا ہے کہ اگر تم میری نعمتوں کا شکر ادا کیا کرو گے میری نافرمانیوں اور ناجائز کاموں میں خرچ نہ کیا اور اپنے اعمال و افعال کو میری مرضی کے مطابق بنانے کی کوشش کی تو میں ان نعمتوں کو اور زیادہ کر دوں گا، یہ زیادتی نعمتوں کی مقدار میں بھی ہو سکتی ہے

اور ان کے بقاء و دوام میں بھی، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو شکر ادا کرنے کی توفیق ہوگئی وہ کبھی نعمتوں میں برکت اور زیادت سے محروم نہ ہوگا (رواہ ابن مردویہ عن ابن عباس مظہری)، اور فرمایا کہ اگر تم نے میری نعمتوں کی ناشکری کی تو میرا عذاب بھی سخت ہے، ناشکری کا حاصل یہی ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور ناجائز کاموں میں صرف کرے، یا اس کے فرائض و واجبات کی ادائیگی میں سستی کرے، اور کفرانِ نعمت کا عذاب شدید دنیا میں بھی یہ ہو سکتا ہے کہ یہ نعمت سلب ہو جائے یا ایسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے کہ نعمت کا فائدہ نہ اٹھا سکے اور آخرت میں بھی عذاب میں گرفتار ہو۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے شکر گزاروں کے لئے تو اجر و ثواب اور نعمت کی زیادتی کا وعدہ اور وہ بھی بلفظ تاکید وعدہ فرمایا ہے لَاَزِيْدَنَّكُمْ لیکن اس کے بالمقابل ناشکری کرنے والوں کے لئے یہ نہیں فرمایا کہ لَاُعَذِّبَنَّكُمْ یعنی میں تمہیں ضرور عذاب دوں گا، بلکہ صرف اتنا فرما کر ڈرایا ہے کہ میرا عذاب بھی جس کو پہونچے، وہ بڑا سخت ہوتا ہے، اس خاص تعبیر میں اشارہ ہے کہ ہر ناشکرے کا گرفتارِ عذاب ہونا کچھ ضروری نہیں معافی کا بھی امکان ہے۔

قَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اگر تم سب اور جتنے آدمی زمین پر آباد ہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے لگو تو یاد رکھو کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، وہ تو سب کی حمد و ثناء اور شکر و ناشکری سے بے نیاز اور بالاتر ہے اور وہ اپنی ذات میں حمید یعنی مستحق حمد ہے، اس کی حمد تم نہ کرو تو اللہ کے سارے فرشتے اور کائنات کا ذرّہ ذرہ کر رہا ہے۔

شکر کا فائدہ جو کچھ ہے وہ تمہارے ہی لئے ہے، اس لئے شکر گذاری کی تاکید اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ اپنے فائدے کے لئے نہیں بلکہ بسبب رحمت تمہیں ہی فائدہ پہونچانے کے لئے ہے۔

مع

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ
کیا نہیں پہنچی تم کو خبر ان لوگوں کی جو پہلے تھے تم سے قوم نوح کی اور عاد اور ثمود

وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ
اور جو ان سے پیچھے ہوئے، کسی کو ان کی خبر نہیں مگر اللہ کو آئے ان کے پاس ان کے رسول

بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ
نشانیاں لے کر پھر تو انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں اور بولے ہم نہیں مانتے جو تم کو

اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝
دے کر بھیجا گیا اور ہم کو تو شبہ ہے اس راہ میں جس کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو خلجان میں ڈالنے والا

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَدْعُوْكُمْ
بولے ان کے رسول کیا اللہ میں شبہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین وہ تم کو بلاتا ہے

لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ قَالُوْٓا
تاکہ بخشے تم کو کچھ گناہ تمہارے اور ڈھیل دے تم کو ایک وعدہ تک جو ٹھہر چکا ہے کہنے لگے

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۭ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ
تم تو یہی آدمی ہو ہم جیسے، تم چاہتے ہو کہ روک دو ہم کو ان چیزوں سے جن کو پوجتے رہے

يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ
ہمارے باپ دادا سو لاؤ کوئی سند کھلی ہوئی، ان کو کہا ان کے رسولوں نے

اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ
ہم تو یہی آدمی ہیں جیسے تم لیکن اللہ احسان کرتا ہے اپنے بندوں میں جس پر

عِبَادِهٖ ۭ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَى
چاہے، اور ہمارا کام نہیں کہ لے آئیں تمہارے پاس سند مگر اللہ کے حکم سے اور اللہ

اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ
پر بھروسہ چاہئے ایمان والوں کو، اور ہم کو کیا ہوا کہ بھروسہ نہ کریں اللہ پر اور

هَدٰىنَا سُبُلَنَا ۭ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
وہ بھلا چکا ہم کو ہماری راہیں، اور ہم صبر کریں گے ایذا پر جو تم ہم کو دیتے ہو اور اللہ پر بھروسہ چاہئے

الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ
بھروسے والوں کو، اور کہا کافروں نے اپنے رسولوں کو ہم نکال دیں گے تم کو

مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ

اپنی زمین سے یا لوٹ آؤ ہمارے دین میں، تب حکم بھیجا ان کو ان کے رب نے ہم غارت کریں گے

الظّٰلِمِيْنَ (۱۳) وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ

ان ظالموں کو، اور آباد کریں گے تم کو اس زمین میں ان کے پیچھے، یہ ملتا ہے

لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ (۱۴) وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ

اس کو جو ڈرتا ہو کھڑے ہونے سے میرے سامنے اور ڈرتا ہو میرے عذاب کے وعدے سے، اور فیصلہ لگے مانگنے پیغمبر اور نامراد

كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۱۵)

ہوا ہر ایک سرکش ضدی۔

خلاصۂ تفسیر

(اے کفار مکہ) کیا تم کو ان لوگوں (کے واقعات) کی خبر (گو اجمالاً ہی) نہیں پہنچی جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں یعنی قوم نوح اور عاد (قوم ہود) اور ثمود (قوم صالح) اور جو لوگ ان کے بعد ہوئے ہیں جن (کی مفصل حالت) کو بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، (کیونکہ ان کے حالات تفصیلات منضبط و منقول نہیں ہوئے، اور وہ واقعات یہ ہیں کہ) ان کے پیغمبر اُن کے پاس دلائل لے کر آئے سو ان قوموں (میں جو کفار تھے انھوں) نے اپنے ہاتھ اُن پیغمبروں کے منہ میں دیدیئے (یعنی مانتے تو کیا یہ کوشش کرتے تھے کہ ان کو بات تک نہ کرنے دیں) اور کہنے لگے کہ جو حکم دے کر تم کو (بزعم تمہارے) بھیجا گیا ہے (یعنی توحید و ایمان) ہم اس کے منکر ہیں، اور جس امر کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو (یعنی وہی توحید و ایمان) ہم تو اس کی جانب سے بہت بڑے شبہ میں ہیں جو (ہم کو) تردد میں ڈالے ہوئے ہے (مقصود اس سے توحید و رسالت دونوں کا انکار ہے، توحید کا تو ظاہر ہے اور رسالت کا تَدْعُوْنَنَآ میں، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم خود اپنی رائے سے دعوتِ توحید کر رہے ہو، مامور و مرسل من اللہ نہیں ہو) ان کے پیغمبروں نے (اس بات کے جواب میں) کہا کیا (تم کو) اللہ تعالیٰ کے بارے میں (یعنی اس کی توحید میں) شک (و انکار) ہے جو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (یعنی اس کا ان چیزوں کو پیدا کرنا خود دلیل اس کی ہستی اور وحدانیت کی ہے، پھر اس دلیل کے ہوتے ہوئے شک کرنا بڑی تعجب کی بات ہے اور تم جو دعوت الی التوحید کو استقلالاً ہماری طرف منسوب کرتے ہو یہ

بھی محض غلط ہے گو توحید بوجہ حق ہونے کے اس قابل ہے کہ اگر کوئی اپنی رائے سے بھی اس کی دعوت کرے تو بھی زیبا ہے، لیکن محل متنازع فیہ میں تو ہماری دعوت بحکم خداوند تعالیٰ ہے پس) وہ (ہی) تم کو (توحید کی طرف) بلا رہا ہے تاکہ (اس کے قبول کرنے کی برکت سے) تمہارے (گذشتہ) گناہ معاف کر دے اور (تمھاری عمر کی) معین مدت تک تم کو (خیر و خوبی کے ساتھ) حیات دے (مطلب یہ کہ توحید علاوہ اس کے کہ فی نفسہ حق ہے تمھارے لئے دونوں جہان میں نافع بھی ہے، اور اس جواب میں دونوں امر کے متعلق جواب ہو گیا، توحید کے متعلق بھی اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ الخ اور رسالت کے متعلق بھی يَدْعُوْكُمْ میں جیسا تقریر ترجمہ سے ظاہر ہے) پھر انھوں نے (پھر دونوں امر کے متعلق گفتگو شروع کی اور) کہا کہ تم (پیغمبر نہیں ہو بلکہ) محض ایک آدمی ہو جیسے ہم ہیں (اور بشریت منافی رسالت ہے، تم جو کہتے ہو وہ من اللہ نہیں ہے بلکہ تم اپنی رائے ہی سے) یوں چاہتے ہو کہ ہمارے آباء و اجداد جس چیز کی عبادت کرتے تھے (یعنی بت) اس سے ہم کو روک دو سو (اگر رسالت کے مدعی ہو تو علاوہ ان دلائل و بینات مذکورہ کے اور) کوئی صاف معجزہ دکھلاؤ (جو ان سب سے واضح تر ہو، اس میں نبوت پر تو کلام ظاہر ہے، اور تَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا میں توحید کلام کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ شرک کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے بزرگ اس کو کرتے تھے) ان کے رسولوں نے (اس کے جواب میں) کہا کہ (تمھاری تقریر کے کئی جزو ہیں، انکارِ توحید دلیل فعل آباء، انکار نبوت مطالبہ سلطان مبین علاوہ بیناتِ سابقہ، سو امر اول کے متعلق فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں جواب ہو گیا، کیونکہ دلیل عقلی کے روبرو رسم و عرف کوئی چیز نہیں، امر دوم کے متعلق ہم اپنی بشریت کو تسلیم کرتے ہیں کہ واقعی) ہم بھی تمھارے جیسے آدمی ہیں لیکن (بشریت اور نبوت میں تنافی نہیں، کیونکہ نبوت ایک اعلیٰ درجہ کا احسانِ خداوندی ہے اور) اللہ کو اختیار ہے کہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے (وہ) احسان فرما دے (اور احسان کے غیر بشر کے ساتھ مختص ہونے کی کوئی دلیل نہیں) اور (امر سوم کے متعلق یہ ہے کہ دعوٰی کے لئے جس میں دعوئ نبوت بھی داخل ہے، نفسِ دلیل اور مطلق بینہ جو دعوٰی نبوت کی صورت میں معجزہ ہوگا ضرور ہے جو کہ پیش کی جا چکی ہے، رہا دلیل و معجزہ خاص جس کو سلطان مبین یعنی صاف دلیل سے تعبیر کر رہے ہو سو اولاً حسب قواعد مناظرہ ضروری نہیں ثانیاً) یہ بات ہمارے قبضہ کی نہیں کہ ہم تم کو کوئی معجزہ دکھلا سکیں بغیر خدا کے حکم کے (پس تمھارے تمام تر شبہات کا جواب ہو گیا، پھر اگر اس پر بھی تم نہ مانو اور مخالفت کئے جاؤ تو خیر ہم تمھاری مخالفت سے نہیں ڈرتے بلکہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں) اور اللہ ہی پر سب

ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے، (چونکہ ہم بھی باایمان ہیں اور ایمان مقتضی ہے توکل کو اس لئے ہم بھی اس کو اختیار کرتے ہیں) اور ہم کو اللہ پر بھروسہ نہ کرنے کا کون امر باعث ہو سکتا ہے، حالانکہ اس نے (ہمارے حال پر بڑا فضل کیا کہ) ہم کو ہمارے (منافع دارین کے) راستے بتلا دیئے (جس کا اتنا بڑا فضل ہو اس پر تو ضرور بھروسہ کرنا چاہئے) اور (ضرر خارجی سے تو یوں بے فکر ہو گئے، رہا ضرر داخلی کہ تمہاری مخالفت کا غم و حزن ہوتا ہو) تم نے (عناد و خلاف کر کے) جو کچھ ہم کو ایذا پہنچائی ہے ہم اس پر صبر کریں گے (پس اس سے بھی ہم کو ضرر نہ رہا اور حاصل اس صبر کا بھی وہی توکل ہے) اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنے والوں کو (ہمیشہ) بھروسہ رکھنا چاہئے اور (ان تمام تر اتمام حجت کے بعد بھی کفار نرم نہ ہوئے بلکہ) ان کفار نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تم کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے، یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آجاؤ (پھر آنا اس لئے کہا کہ سکوت قبل بعثت سے وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کا اعتقاد بھی ہم ہی جیسا ہوگا) پس ان رسولوں پر ان کے رب نے (تسلی کے لئے) وحی نازل فرمائی کہ (یہ بیچارے تم کو کیا نکالیں گے ہم (ہی) ان ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے اور ان کے (ہلاک کرنے کے) بعد تم کو اس سرزمین میں آباد رکھیں گے (اور) یہ (وعدہ آباد رکھنے کا کچھ تمہارے ساتھ خاص نہیں، بلکہ) ہر اس شخص کے لئے (عام) ہے جو میرے روبرو کھڑے ہونے سے ڈرے اور میری وعید سے ڈرے (مراد یہ کہ جو مسلمان ہو جس کی علامت خوف قیامت اور خوف وعید ہے سب کیلئے یہ وعدہ عذاب سے نجات دینے کا عام ہے) اور (پیغمبروں نے جو یہ مضمون کفار کو سنایا کہ تم نے دلائل کے فیصلہ کو نہ مانا، اب عذاب سے فیصلہ ہونے والا ہے، یعنی عذاب آنے والا ہے تو) کفار (چونکہ جہل مرکب و عناد میں غرقاب تھے اس سے بھی نہ ڈرے بلکہ کمال بیباکی سے وہ) فیصلہ چاہنے لگے (جیسا آیت فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا وارد امثالہا سے معلوم ہوتا ہے) اور (جب وہ فیصلہ آیا تو) جتنے سرکش (اور) ضدی لوگ تھے وہ سب (اس فیصلہ میں) بے مراد ہوئے (یعنی ہلاک ہو گئے اور جو اُن کی مراد تھی کہ اپنے کو اہل حق سمجھ کر فتح و ظفر چاہتے تھے وہ حاصل نہ ہوئی:

مِنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا

پیچھے اس کے دوزخ ہے اور پلائیں گے اس کو پانی پیپ کا، گھونٹ گھونٹ پیتا ہوا اس کو اور

يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَ

گلے سے نہیں اتار سکتا اور چلی آتی ہو اس پر موت ہر طرف سے اور وہ نہیں مرتا، اور

مِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾	
اس کے پیچھے عذاب ہے سخت۔	

خلاصۂ تفسیر

(جس جبار عنید کا اوپر ذکر ہوا ہے علاوہ دنیوی عذاب کے) اس کے آگے دوزخ (کا عذاب آنے والا) ہے اور اس کو (دوزخ میں) ایسا پانی پینے کو دیا جاوے گا جو کہ پیپ لہو (کے مشابہ) ہوگا جس کو (غایت تشنگی کی وجہ سے) گھونٹ گھونٹ کر کے پیوے گا اور (غایت حرارت و کراہت کی وجہ سے) گلے سے آسانی کے ساتھ اتارنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور ہر (چہار) طرف سے اس پر (سامان) موت کی آمد ہوگی اور وہ کسی طرح مرے گا نہیں (بلکہ یوں ہی سسکتا رہے گا) اور (پھر یہی نہیں کہ یہی عذاب مذکور ایک حالت پر رہے بلکہ) اس (شخص) کو اور (زیادہ سخت عذاب کا سامنا (برابر) ہوا کرے) گا (جس سے عادت پڑنے کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا کقولہ تعالیٰ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا)۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ

حال ان لوگوں کا جو منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے عمل ہیں جیسے وہ راکھ کر زور کی چلے اس پر

بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ

ہوا آندھی کے دن، کچھ اُن کے ہاتھ میں نہ ہوگا اپنی کمائی میں سے،

ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ

یہی ہو بہک کر دور جا پڑنا، تو نے کیا نہیں دیکھا کہ اللہ نے بنائے آسمان اور

الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾

زمین جیسی چاہئے، اگر چاہے تم کو لیجاوے اور لاوے کوئی پیدائش نئی۔

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ

اور یہ اللہ کو کچھ مشکل نہیں، اور سامنے کھڑے ہوں گے اللہ کے سارے پھر کہیں گے

الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ

کمزور بڑائی والوں کو ہم تو تمہارے تابع تھے، سو کیا بچاؤ گے

مُغْنُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ

ہم کو اللہ کے کسی عذاب سے کچھ ، وہ کہیں گے اگر ہدایت کرتا ہم کو اللہ

لَهَدَیْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ

تو البتہ ہم تم کو ہدایت کرتے ، اب برابر ہے ہمارے حق میں ہم بیقراری کریں یا صبر کریں ہم کو نہیں

مَّحِیْصٍ ﴿۲۱﴾ وَقَالَ الشَّیْطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ

خلاصی ، اور بولا شیطان جب فیصل ہو چکا سب کام بیشک اللہ نے تم کو دیا تھا

وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ

سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا پھر جھوٹا کیا ، اور میری تم پر کچھ حکومت نہ

سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا

تھی مگر یہ کہ میں نے بلایا تم کو پھر تم نے مان لیا میری بات کو سو الزام نہ دو مجھ کو اور الزام دو

اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِیَّ ؕ اِنِّیْ كَفَرْتُ

اپنے آپ کو ، نہ میں تمہاری فریاد کو پہنچوں اور نہ تم میری فریاد کو پہنچو ، میں منکر ہوں

بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۲۲﴾

جو تم نے مجھ کو شریک بنایا تھا اس سے پہلے ، البتہ جو ظالم ہیں ان کے لئے ہے عذاب دردناک۔

خلاصۂ تفسیر

ان کافروں کو اگر اپنی نجات کے متعلق یہ زعم ہو کہ ہمارے اعمال ہم کو نافع ہوں گے تو اس کا قاعدہ کلیہ تو یہ سن لو کہ) جو لوگ اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کی حالت باعتبار عمل کے یہ ہے (یعنی ان کے اعمال کی ایسی مثال ہے) جیسے کچھ راکھ ہو (جو اڑنے میں بہت خفیف ہوتی ہے) جس کو تیز آندھی کے دن میں تیزی کے ساتھ ہوا اڑا لے جاوے (کہ اس صورت میں اس راکھ کا نام و نشان بھی نہ رہے گا اسی طرح) ان لوگوں نے جو کچھ عمل کئے تھے اس کا کوئی حصہ (یعنی اثر و نفع کے قبیل سے) ان کو حاصل نہ ہوگا (اس راکھ کی طرح ضائع و برباد جائے گا) یہ بھی بڑی دور دراز کی گمراہی ہے (کہ گمان تو ہو کہ ہمارے عمل نیک اور نافع ہیں اور پھر ظاہر ہو بد اور مضر جیسے عبادات اصنام یا غیر نافع جیسے اعتاق و صلہ رحمی، اور چونکہ حق سے اس کو

بہت بُعد ہے اس لئے کہا گیا ، پس اس طریق تو نجات کا احتمال نہ رہا ، اور اگر ان کا یہ زعم ہو کہ قیامت ہی کا وجود محال ہے اور اس صورت میں عذاب کا احتمال نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ) کیا (اے مخاطب) تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو بالکل ٹھیک ٹھیک (یعنی مشتمل بر منافع و مصالح) پیدا کیا ہے (اور اس سے قادر ہونا اس کا ظاہر ہے پس جب وہ قادر مطلق ہے تو) اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور ایک دوسری نئی مخلوق پیدا کر دے اور یہ خدا کو کچھ بھی مشکل نہیں (پس جب نئی مخلوق پیدا کرنا آسان ہے تو تم کو دوبارہ پیدا کر دینا کیا مشکل ہے) اور (اگر یہ وسوسہ ہو کہ ہمارے اکابر ہم کو بچالیں گے تو اس کی حقیقت سن لو کہ قیامت کے دن) خدا کے سامنے سب پیش ہوں گے پھر چھوٹے درجہ کے لوگ (یعنی عوام و تابعین) بڑے درجہ کے لوگوں سے (یعنی خواص و متبوعین سے بطور ملامت و عتاب) کہیں گے کہ ہم (دنیا میں) تمہارے تابع تھے (حتی کہ دین کی جو راہ تم نے ہم کو بتلائی ہم اسی پر ہو لئے ، اور آج ہم پر مصیبت ہے) تو کیا تم خدا کے عذاب کا کچھ جزو ہم سے ہٹا سکتے ہو (یعنی اگر بالکل نہ بچا سکو تو کسی قدر بھی بچا سکتے ہو) وہ (جواب میں) کہیں گے کہ (ہم تم کو کیا بچاتے خود ہی نہیں بچ سکتے ہیں البتہ) اگر اللہ ہم کو (کوئی) راہ (بچنے کی) بتلاتا تو ہم تم کو بھی (وہ) راہ بتلا دیتے (اور اب تو) ہم سب کے حق میں دونوں صورتیں برابر ہیں خواہ ہم پریشان ہوں ، (جیسا کہ تمہاری پریشانی فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ سے ظاہر ہے اور ہماری پریشانی تو لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ سے ظاہر ہی ہے) خواہ ضبط کریں (دونوں حالتوں میں) ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں (پس اس سوال جواب سے یہ معلوم ہو گیا کہ طریق کفر کے اکابر بھی اپنے متبعین کے کچھ کام نہ آئیں گے ، یہ طریق بھی نجات کا محتمل نہ رہا) اور (اگر اس کا بھروسہ ہو کہ یہ معبودین غیر اللہ کام آدیں گے اس کا حال اس حکایت سے معلوم ہو جائے گا کہ) جب (قیامت میں) تمام مقدمات فیصل ہو چکیں گے (یعنی اہل ایمان جنت میں اور کفار دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے) تو (اہل دوزخ سب شیطان کے پاس کہ وہ بھی وہاں ہوگا جا کر ملامت کریں گے کہ کم بخت تو تو ڈوبا ہی تھا ہم کو بھی اپنے ساتھ ڈبویا اُس وقت) شیطان (جواب میں) کہے گا کہ (مجھ پر تمہاری ملامت ناحق ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے تم سے (جتنے وعدے کئے تھے سب) سچے وعدے کئے تھے (کہ قیامت ہوگی اور کفر سے ہلاکت ہوگی اور ایمان سے نجات ہوگی) اور میں نے بھی وعدے تم سے کئے تھے (کہ قیامت نہ ہوگی اور تمہارا طریقہ کفر بھی طریقہ نجات ہے) سو میں نے وہ وعدے تم سے خلاف کئے تھے (اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے حق ہونے پر اور میرے وعدوں کے باطل ہونے پر دلائل قطعیہ قائم تھے ، سو باوجود اس کے تم نے میرے وعدوں کو صحیح

اور خدا تعالیٰ کے وعدوں کو غلط سمجھا، تو اپنے ہاتھوں تم ڈوبے) اور (اگر تم یوں کہو کہ آخر سچے وعدوں کو جھوٹا سمجھنے اور جھوٹے وعدوں کو سچا سمجھنے کا سبب بھی تو میں ہی ہوا تو بات یہ ہے کہ واقعی میں اغواء کے مرتبہ میں سبب ضرور ہوا، لیکن یہ دیکھو کہ میرے اغواء کے بعد تم مختار تھے، یا مضطر و مجبور، سو ظاہر ہے کہ) میرا تم پر اور تو کچھ زور چلتا نہ تھا بجز اس کے کہ میں نے تم کو (گمراہی کی طرف) بلایا تھا سو تم نے (باختیار خود) میرا کہنا مان لیا، اگر نہ مانتے تو میں بزور تم کو گمراہ نہ کر سکتا تھا، جب یہ بات ثابت ہے) تو مجھ پر (ساری) ملامت مت کرو (اس طرح سے کہ اپنے کو بالکل بری سمجھنے لگو) اور (زیادہ) ملامت اپنے آپ کو کرو (کیونکہ اصل علت عذاب کی تمہارا ہی فعل ہے اور میرا فعل تو محض سبب ہے جو بعید اور غیر مستلزم ہے، پس ملامت کا تو یہ جواب ہے، اور اگر مقصود اس قول سے استعانت و استمداد ہے تو میں کسی کی کیا مدد کروں گا، خود ہی مبتلائے مصیبت و محتاج امداد ہو رہا ہوں، لیکن جانتا ہوں کہ کوئی میری مدد نہ کرے گا ورنہ میں بھی تم سے اپنے لئے مدد چاہتا کیونکہ زیادہ مناسبت تم سے ہے بس اب تو) نہ میں تمہارا مددگار ہو سکتا ہوں اور نہ تم میرے مددگار (ہو سکتے) ہو (البتہ اگر میں تمہارے طریقہ شرک کو حق سمجھتا تو بھی اس تعلق کی وجہ سے نصرت کا مطالبہ کرنے کی گنجائش تھی لیکن) میں خود تمہارے اس فعل سے بیزار ہوں (اور اس کو باطل سمجھتا ہوں) کہ تم اس کے قبل (دنیا میں) مجھ کو (خدا کا) شریک قرار دیتے تھے (یعنی درپارۂ عبادت اصنام وغیرہا میری ایسی اطاعت کرتے تھے جو اطاعت کہ خاصۂ حق تعالیٰ ہے، پس اصنام کو شریک ٹھہرانا بایں معنی شیطان کو شریک ٹھہرانا ہے، پس مجھ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں نہ تم کو استمداد کا کوئی حق ہے پس) یقیناً ظالموں کے لئے دردناک عذاب (مقرر) ہے (پس عذاب میں پڑے رہو نہ مجھ پر ملامت کرنے سے نفع کی امید رکھو اور نہ مدد چاہنے سے جو تم نے ظلم کیا تھا تم بھگتو جو میں نے کیا تھا میں بھگتوں گا، پس گفتگو قطع کرو، یہ حاصل ہوا ابلیس کے جواب کا، پس اس سے معبودین غیر اللہ کا بھروسہ بھی قطع ہوا کیونکہ جو ان معبودین کی عبادت کا اصل بانی و محرک ہے اور درحقیقت عبادت غیر اللہ سے زیادہ راضی وہی ہوتا ہے، چنانچہ اسی بناء پر قیامت کے دن دوزخ میں اہل نار اسی سے کہیں سنیں گے، اور کسی معبود غیر اللہ سے کچھ بھی نہ کہیں گے، جب اس نے صاف جواب دیدیا تو اوروں سے کیا امید ہو سکتی ہے، پس نجات کفار کے سب طریقے مسدود ہو گئے، اور یہی مضمون مقصود تھا)۔

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ

اور داخل کئے گئے جو لوگ ایمان لائے تھے اور کام کئے تھے نیک، باغوں میں جن کے نیچے

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں ان میں اپنے رب کے حکم سے ان کی ملاقات ہے وہاں سلام

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے وہ ایسے باغوں میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور) وہ ان میں اپنے پروردگار کے حکم سے ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) وہاں ان کو سلام اس لفظ سے کیا جائے گا السلام علیکم (یعنی باہم بھی اور فرشتوں کی طرف سے بھی، لقولہ تعالیٰ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ولقولہ تعالیٰ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۚ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ الآیۃ)

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا

تو نے نہ دیکھا کیسی بیان کی اللہ نے ایک مثال بات ستھری جیسے ایک درخت ستھرا اس کی

ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاۗءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ

جڑ مضبوط ہو اور ٹہنی ہے آسمان میں، لاتا ہے پھل اپنا ہر وقت پر اپنے رب کے حکم سے

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ فکر کریں۔

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ کو معلوم نہیں (یعنی اب معلوم ہو گیا) کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی (اچھی اور موقع کی) مثال بیان فرمائی ہے کلمۂ طیبہ کی (یعنی کلمۂ توحید و ایمان کی) کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے (مراد کھجور کا درخت ہے) جس کی جڑ (زمین کے اندر) خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں (اور) وہ (درخت) خدا کے حکم سے ہر فصل میں (یعنی جب اس کی فصل آجاوے) اپنا پھل دیتا ہو (یعنی خوب پھلتا ہو، کوئی فصل ماری نہ جاتی ہو، اسی طرح کلمۂ توحید یعنی لا الٰہ الا اللہ کی ایک جڑ ہے، یعنی اعتقاد جو مومن کے قلب میں استحکام کے ساتھ جاگیر ہے، اور اس کی کچھ شاخیں ہیں یعنی اعمالِ صالحہ جو ایمان پر مرتب ہوتے ہیں جو بارگاہِ قبولیت میں آسمان کی طرف لے جائے جاتے ہیں، پھر ان پر رضائے دائمی کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ

(اس قسم کی) مثالیں لوگوں (کے بتلانے) کے واسطے اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ لوگ معانی مقصود کو خوب سمجھ لیں (کیونکہ مثال سے مقصود کی خوب توضیح ہو جاتی ہے)۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ

اور مثال گندی بات کی جیسے درخت گندا اکھاڑ لیا اس کو زمین کے اوپر سے

مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿٢٦﴾ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ

کچھ نہیں اس کو ٹھہراؤ، مضبوط کرتا ہے اللہ ایمان والوں کو مضبوط بات سے دنیا کی زندگی

الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۚ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ﴿٢٧﴾

میں اور آخرت میں اور بچلا دیتا ہے اللہ بے انصافوں کو اور کرتا ہے اللہ جو چاہے،

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ

تو نے نہ دیکھا ان کو جنھوں نے بدلہ کیا اللہ کے احسان کا ناشکری اور اتارا اپنی قوم کو

دَارَ الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾

تباہی کے گھر میں، جو دوزخ ہے داخل ہوں گے اس میں اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور گندہ کلمہ کی (یعنی کلمۂ کفر و شرک کی) مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو (مراد درخت حنظل ہے) کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جاوے (اور) اس کو (زمین میں) کچھ ثبات نہ ہو (خراب فرمایا باعتبار اس کی بو اور مزہ اور رنگ کے یا اس کے پھل کی بو اور مزہ اور رنگ کے یہ صفت طیبہ کے مقابل ہوئی اور اوپر سے اکھاڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جڑ اس کی دور تک نہیں ہوتی اوپر ہی کچھ ہوتی ہے، یہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ کے مقابل فرمایا اور مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ اسی کی تاکید کے لئے فرمایا اور اس کی شاخوں کا اونچا نہ جانا اور اس کے پھل کا تَقَبُّلًا مطلوب نہ ہونا ظاہر ہے یہی حال کلمۂ کفر کا ہے کہ گو کافر کے دل میں اس کی جڑ ہے مگر حق کے سامنے اس کا مضمحل و مغلوب ہو جانا مشابہ اسی کے ہے جیسے اس کی جڑ ہی نہیں، قال تعالیٰ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ اور شاید مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ کی تصریح سے کفر کا یہی اضمحلال و مغلوبیت بتلانا مقصود ہو، اور چونکہ اس کے اعمال مقبول نہیں ہوتے، اس لئے گویا اس درخت کی شاخیں بھی فضا میں نہیں پھیلیں، اور چونکہ اس کے

اعمال پر رضائے الٰہی مرتب نہیں ہوتی اس لئے پھل کی نفی بھی ظاہر ہے، اور چونکہ قبول و رضا کا فرض بالکل احتمال نہیں اسی لئے مشبہ بہ کی جانب میں شاخوں اور پھل کا ذکر قطعاً متروک فرما دیا ہو، بخلاف نفس کفر کے کہ اس کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ اس کا وجود محسوس بھی ہے اور احکام جہاد وغیرہ میں معتبر بھی ہے، یہ تو دونوں کی مثال ہوگئی، آگے اثر کا بیان ہے کہ) اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات (یعنی کلمۂ طیبہ ثابت الاصل کی برکت) سے دنیا میں اور آخرت (دونوں جگہوں) میں (دین میں اور امتحان میں) مضبوط رکھتا ہے اور (اس کلمۂ خبیثہ کی نحوست سے) ظالموں (یعنی کافروں) کو (دونوں جگہ دین میں اور امتحان میں) بچلا دیتا ہے اور (کسی کو ثابت رکھنے اور کسی کو بچلا دینے میں ہزاروں حکمتیں ہیں پس) اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتا ہے کرتا ہے، کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (یعنی ان کا حال عجیب ہے) جنھوں نے بجائے نعمت الٰہی (کے شکر) کے کفر کیا (مراد اس سے کفار مکہ ہیں، کذا فی الدر المنثور عن ابن عباسؓ) اور جنھوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں پہنچایا (یعنی ان کو بھی کفر کی تعلیم کی جس سے) وہ اس (جہنم) میں داخل ہوں گے اور وہ رہنے کی بری جگہ ہے (اس میں اشارہ ہوگیا کہ ان کا داخل ہونا قرار اور دوام کے لئے ہوگا)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلے ایک آیت میں حق تعالیٰ نے کفار کے اعمال کی یہ مثال بیان فرمائی ہے کہ وہ راکھ کی مانند ہیں جس پر تیز اور سخت ہوا چل جائے تو اس کا ذرہ ذرہ ہوا میں منتشر ہو کر بے نشان ہو جائے، پھر کوئی اس کو جمع کر کے اس سے کوئی کام لینا چاہے تو ناممکن ہو جائے، مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ، مطلب یہ ہے کہ کافر کے اعمال جو بظاہر اچھے بھی ہوں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں، اس لئے سب ضائع اور بیکار ہیں۔

اس کے بعد مذکورہ آیات میں پہلے مؤمن اور اس کے اعمال کی ایک مثال دی گئی ہے پھر کفار و منافقین کے اعمال کی، پہلی آیت میں مؤمن اور اس کے اعمال کی مثال ایک ایسے درخت سے دی گئی ہے جس کا تنہ مضبوط اور بلند ہو اور اس کی جڑیں زمین میں گہری گئی ہوئی ہوں اور زیر زمین پانی کے چشموں سے سیراب ہوتی ہوں، گہری جڑوں کی وجہ سے اس درخت کو استحکام اور مضبوطی بھی حاصل ہو کہ ہوا کے جھونکے سے گر نہ جائے، اور سطح زمین سے دور ہونے کی وجہ سے اس کا پھل گندگی سے پاک صاف رہے، دوسری صفت اس درخت کی یہ ہے کہ اس کی شاخیں بلندی پر

آسمان کی طرف ہوں، تیسری صفت اس درخت کی یہ ہے کہ اس کا پھل ہر وقت ہر حال میں کھایا جاتا ہو۔

یہ درخت کونسا اور کہاں ہے؟ اس کے متعلق مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، مگر زیادہ اقرب یہ ہے کہ وہ کھجور کا درخت ہے، اس کی تائید تجربہ اور مشاہدہ سے بھی ہوتی ہے، اور روایاتِ حدیث سے بھی، کھجور کے درخت کے تنہ کا بلند اور مضبوط ہونا تو مشاہدہ کی چیز ہے، سب ہی جانتے ہیں، اس کی جڑوں کا زمین کی دور گہرائی تک پہونچنا بھی معروف و معلوم ہے، اور اس کا پھل بھی ہر وقت اور ہر حال میں کھایا جاتا ہے، جس وقت سے اس کا پھل درخت پر ظاہر ہوتا ہے اس وقت سے پکنے کے زمانہ تک ہر حال اور ہر صورت میں اس کا پھل مختلف طریقوں سے چٹنی و اچار کے طریقہ سے یا دوسرے طریقہ سے کھایا جاتا ہے، پھر پھل پک جانے کے بعد اس کا ذخیرہ بھی پورے سال باقی رہتا ہے، صبح و شام، دن اور رات، گرمی اور سردی، غرض ہر موسم اور ہر وقت میں کام دیتا ہے، اس درخت کا گودا بھی کھایا جاتا ہے، اس سے میٹھا رس بھی نکالا جاتا ہے، اس کے پتوں سے بہت سی مفید چیزیں چٹائیاں وغیرہ بنتی ہیں، اس کی گٹھلی جانوروں کا چارہ ہے، بخلاف دوسرے درختوں کے پھلوں کے کہ وہ خاص موسم میں آتے ہیں، اور ختم ہو جاتے ہیں، ان کا ذخیرہ نہیں رکھا جاتا ہے، اور نہ ان کی ہر چیز سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

اور ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے بروایت انس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شجرۃ طیبۃ (جس کا ذکر قرآن میں ہے) کھجور کا درخت ہے اور شجرۃ خبیثۃ حنظل کا درخت (مظہری)

اور مسند احمد میں بروایت مجاہدؒ مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک روز ہم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، کوئی صاحب آپؐ کے پاس کھجور کے درخت کا گودہ لائے، اس وقت آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے ایک سوال کیا کہ درختوں میں سے ایک ایسا درخت بھی ہے جو مردِ مؤمن کی مثال ہے، (اور بخاری کی روایت میں اس جگہ یہ بھی مذکور ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اس درخت کے پتے کسی موسم میں جھڑتے نہیں) بتلاؤ وہ درخت کونسا ہے؟ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ کہہ دوں وہ کھجور کا درخت ہے، مگر مجلس میں ابوبکرؓ و عمرؓ اور دوسرے اکابر صحابہ موجود تھے، ان کو خاموش دیکھ کر مجھے بولنے کی ہمت نہ ہوئی، پھر خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔

مؤمن کی مثال اس درخت سے دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ کلمۂ طیبہ میں ایمان اس کی جڑ ہے، جو بہت مستحکم اور مضبوط ہے، دنیا کے حوادث اس کو ہلا نہیں سکتے، مؤمنین کاملین صحابہ و تابعین بلکہ ہر زمانہ کے سچے مسلمانوں کی ایسی مثالیں کچھ کم نہیں کہ ایمان کے مقابلہ میں

نہ جان کی پروا کی نہ مال کی اور نہ کسی دوسری چیز کی، دوسری وجہ ان کی طہارت و نظافت ہے کہ دنیا کی گندگیوں سے متاثر نہیں ہوتے، جیسے بڑے درخت پر سطحِ زمین کی گندگی کا کوئی اثر نہیں ہوتا، یہ دو وصف تو اَصْلُهَا ثَابِتٌ کی مثال ہیں، تیسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح کھجور کے درخت کی شاخیں بلند آسمان کی طرف ہوتی ہیں، مؤمن کے ایمان کے ثمرات یعنی اعمال بھی آسمان کی طرف اٹھائے جاتے ہیں، قرآن کریم میں ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں پاکیزہ کلمات، مطلب یہ ہے کہ مؤمن جو اللہ تعالیٰ کا ذکر تسبیح، تہلیل، قراءۃ قرآن وغیرہ کرتا ہے یہ صبح شام اللہ تعالیٰ کے پاس پہونچتے رہتے ہیں۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کھجور کا پھل ہر وقت، ہر حال، ہر موسم میں لیل و نہار کھایا جاتا ہے مؤمن کے اعمالِ صالحہ بھی ہر وقت، ہر موسم اور ہر حال میں صبح شام جاری ہیں، اور جس طرح کھجور کے درخت کی ہر چیز کارآمد ہے، مؤمن کا ہر قول و فعل اور حرکت و سکون اور اس سے پیدا ہونے والے آثار پوری دنیا کے لئے نافع و مفید ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ مؤمن کامل اور تعلیماتِ خدا و رسول کا پابند ہو۔

مذکورہ تقریر سے معلوم ہوا کہ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ میں اُکُل سے مراد پھل اور کھانے کے لائق چیزیں ہیں اور حین سے مراد ہر وقت ہر حال ہے، اکثر مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے، بعض حضرات کے دوسرے اقوال بھی ہیں۔

کفار کی مثال اس کے بالمقابل دوسری مثال کفار کی شَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ سے دی گئی جس طرح كَلِمَةً طَيِّبَةً مراد قول لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی ایمان ہے، اسی طرح كَلِمَةً خَبِيْثَةً سے مراد کلماتِ کفر اور افعالِ کفر ہیں، شجرۂ خبیثہ سے مراد مذکورہ حدیث میں حنظل کو قرار دیا گیا ہے، اور بعض نے لہسن وغیرہ کہا ہے۔

اس شجرۂ خبیثہ کا حال قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ اس کی جڑیں زمین کے اندر زیادہ نہیں ہوتیں اس لئے جب کوئی چاہے اس درخت کے پورے جثہ کو زمین سے اکھاڑ سکتا ہے، اُجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ کے یہی معنی ہیں، کیونکہ اُجْتُثَّتْ کے اصل معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے جثہ کو پورا پورا اٹھا لیا جائے۔

کافر کے اعمال کو اس درخت سے تشبیہ دینے کی وجہ ظاہر ہے کہ اوّل تو اس کے عقائد کی کوئی جڑ بنیاد نہیں، ذرا دیر میں متزلزل ہو جاتے ہیں، دوسرے دنیا کی گندگی سے متاثر ہوتے ہیں، تیسرے ان کے درخت کے پھل پھول یعنی اعمال و افعال عند اللہ کارآمد نہیں۔

ایمان کا خاص اثر اس کے بعد مؤمن کے ایمان اور کلمۂ طیبہ کا ایک خاص اثر دوسری

آیت میں بیان فرمایا ہے یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ یعنی مؤمن کا کلمہ طیبہ مضبوط و مستحکم درخت کی طرح ایک قول ثابت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ قائم و برقرار رکھتے ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، بشرطیکہ یہ کلمہ اخلاص کے ساتھ کہا جائے، اور لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ کر اختیار کیا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ اس کلمۂ طیبہ پر ایمان رکھنے والے کی دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک اس کلمہ پر قائم رہتا ہے، خواہ اس کے خلاف کتنے ہی حوادث سے مقابلہ کرنا پڑے اور آخرت میں اس کلمہ کو قائم و برقرار رکھ کر اس کی مدد کی جاتی ہے، صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آخرت سے مراد اس آیت میں برزخ یعنی قبر کا عالم ہے۔

قبر کا عذاب و ثواب قرآن و حدیث سے ثابت ہے

حدیث یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قبر میں مؤمن سے سوال کیا جائے گا تو ایسے ہولناک مقام اور سخت حال میں بھی وہ بتائید ربانی اس کلمہ پر قائم رہے گا، اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دے گا، اور پھر فرمایا کہ ارشاد قرآنی یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ کا یہی مطلب ہے، یہ روایت حدیث حضرت براء بن عازبؓ نے نقل فرمائی۔ اسی طرح تقریباً چالیس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے معتبر اسانید کے ساتھ اسی مضمون کی حدیثیں منقول ہیں جن کو امام ابن کثیر نے اس جگہ اپنی تفسیر میں جمع کیا ہے، اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنے منظوم رسالہ التثبیت عند التبییت میں اور شرح الصدور میں ستر احادیث کا حوالہ نقل کر کے ان روایات کو متواتر فرمایا ہے، ان سب حضرات صحابۂ کرام نے آیت مذکورہ میں آخرت سے مراد قبر اور اس آیت کو قبر کے عذاب و ثواب سے متعلق قرار دیا ہے۔

مرنے اور دفن ہونے کے بعد قبر میں انسان کا دوبارہ زندہ ہو کر فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا، پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارۃً اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ستر احادیث متواترہ میں بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے، جس میں مسلمان کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں، رہے وہ عالمیانہ شبہات کہ دنیا میں دیکھنے والوں کو یہ ثواب و عذاب نظر نہیں آتے، سو اس کے تفصیلی جوابات کی تو یہاں گنجائش نہیں، اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کسی چیز کا نظر نہ آنا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، جنات اور فرشتے بھی کسی کو نظر نہیں آتے مگر موجود ہیں، ہوا نظر نہیں آتی، مگر موجود ہے، جس کائناتی فضا کا اس زمانہ میں راکٹوں کے ذریعہ مشاہدہ ہو رہا ہے وہ اب سے پہلے کسی کو نظر نہ آتی تھی مگر موجود تھی، خواب دیکھنے والا خواب میں کسی مصیبت میں

گرفتار ہو کر سخت عذاب میں بے چین ہوتا ہے، مگر پاس بیٹھنے والوں کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔

اصول کی بات یہ ہے کہ ایک عالم کو دوسرے عالم کے حالات پر قیاس کرنا خود غلط ہے، جب خالق کائنات نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ دوسرے عالم میں پہونچنے کے بعد اس عذاب و ثواب کی خبر دیدی تو اس پر ایمان و اعتقاد رکھنا لازم ہے۔

آخر آیت میں فرمایا وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ مؤمنین کو تو کلمہ طیبہ اور قول ثابت پر ثابت قدم رکھتے ہیں، اور اس کے نتیجہ میں قبر ہی سے ان کے لئے راحت کے سامان جمع ہو جاتے ہیں، مگر ظالموں یعنی کفار و مشرکین کو یہ خداوندی نصرت و امداد نہیں ملتی، منکر نکیر کے سوالات کا صحیح جواب نہیں دے سکتے، اور انجام کار ابھی سے ایک قسم کے عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے، کوئی طاقت نہیں جو اس کے ارادہ اور مشیت کو روک سکے، حضرت ابی بن کعبؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، حذیفہ بن یمانؓ وغیرہ حضرات صحابہ نے فرمایا ہے کہ مؤمن کو اس کا اعتقاد لازم ہے کہ اس کو جو چیز حاصل ہوئی وہ اللہ کی مشیت اور ارادہ سے حاصل ہوئی، اس کا ٹلنا ناممکن تھا، اسی طرح جو چیز حاصل نہیں ہوئی اس کا حاصل ہونا ممکن نہ تھا، اور فرمایا کہ اگر تمہیں اس پر یقین و اعتماد نہ ہو تو تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ یعنی کیا آپ ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بدلہ میں کفر اختیار کر لیا، اور اپنی قوم کو جو ان کے کہنے پر چلتی تھی ہلاکت و بربادی کے مقام میں اتار دیا، وہ جہنم میں جلیں گے، اور جہنم بہت برا ٹھکانا ہے۔

یہاں نعمۃ اللہ سے اللہ تعالیٰ کی عام نعمتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں، جو محسوس و مشاہد ہیں، اور جن کا تعلق انسان کے ظاہری منافع سے ہے جیسا کھانے پینے پہننے کی اشیاء، زمین اور مکان وغیرہ اور وہ مخصوص معنوی نعمتیں بھی ہو سکتی ہیں جو انسان کے رشد و ہدایت کے لئے حق تعالیٰ کی طرف سے آئی ہیں، مثلاً انبیاء اور آسمانی کتابیں اور جو نشانیاں اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کی اپنے وجود کے ہر جوڑ میں پھر زمین اور اس کی بے شمار مخلوقات میں، آسمان اور اس کی ناقابل ادراک کائنات میں انسان کی ہدایات کا سامان ہیں۔

ان دونوں قسم کی نعمتوں کا تقاضا یہ تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت کو پہچانتا اس کی نعمتوں کا شکر گذار ہو کر اس کی فرمانبرداری میں لگ جاتا، مگر کفار و مشرکین نے نعمتوں کا

مقابلہ شکر کے بجائے کفرانِ نعمت اور سرکشی و نافرمانی سے کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی قوم کو ہلاکت و بربادی کے مقام میں ڈال دیا اور خود بھی ہلاک ہوئے۔

احکام و ہدایات ان تینوں آیتوں میں توحید اور کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کی عظمت و فضیلت اور اس کی برکات و ثمرات اور اس سے انکار کی نحوست اور انجام بد کا بیان ہوا ہے کہ توحید ایسی لازوال دولت ہے جس کی برکت سے دنیا میں تائید ایزدی ساتھ ہوتی ہے، اور آخرت اور قبر میں بھی، اور اس سے انکار اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو عذاب سے بدل ڈالنے کے مرادف ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ

اور ٹھہرائے اللہ کے لئے مقابل کہ بہکائیں لوگوں کو اس کی راہ سے، تو کہہ مزا اڑا لو پھر

مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ۝۳۰ قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا

تم کو لوٹنا ہے طرف آگ کی، کہہ دے میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں قائم رکھیں

الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ

نماز اور خرچ کریں ہماری دی ہوئی روزی میں سے پوشیدہ اور ظاہر پہلے اس سے کہ

اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ۝۳۱ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ

آئے وہ دن جس میں نہ سودا ہے نہ دوستی، اللہ وہ ہے جس نے بنائے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ

آسمان اور زمین اور اتارا آسمان سے پانی پھر اس سے نکالی روزی

مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ

تمہاری میوے، اور کہنے میں کیا تمہارے کشتی کو کہ چلے

فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝۳۲ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ

دریا میں اس کے حکم سے اور کام میں لگا دیا تمہارے ندیوں کو، اور کام میں لگا دیا تمہارے سورج

وَالْقَمَرَ دَاۗىِٕبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝۳۳ وَاٰتٰىكُمْ

اور چاند کو ایک دستور پر برابر اور کام میں لگا دیا تمہارے رات اور دن کو، اور دیا تم کو

مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ

ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی، اور اگر گنو احسان اللہ کے نہ پورے کر سکو

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝۳۴

بیشک آدمی بڑا بے انصاف ہے ناشکر

خلاصۂ تفسیر

اور (اوپر جو کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے شکرِ نعمت کی جگہ کفر کیا اور اپنی قوم کو جہنم میں پہنچایا اس کفر اور پہنچانے کا بیان یہ ہے کہ) ان لوگوں نے اللہ کے ساجھی قرار دیئے تاکہ (دوسروں کو بھی) اس کے دین سے گمراہ کریں (پس ساجھی قرار دینا کفر ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنا جہنم میں پہنچانا ہے) آپ (ان سب سے) کہہ دیجئے کہ چند دے عیش کر لو، کیونکہ آخر انجام تمہارا دوزخ میں جانا ہے (عیش سے مراد حالتِ کفر میں رہنا ہے کیونکہ ہر شخص کو اپنے مذہب میں لذت ہوتی ہے، یعنی اور چند دے کفر کر لو یہ تہدید ہے، اور مطلب "کیونکہ" کا یہ ہے کہ چونکہ جہنم میں جانا تو تمہارا ضروری ہے، اس واسطے کفر سے باز آنا تمہارا مشکل ہے، خیر، اور چند دے گذار لو، پھر تو اس مصیبت کا سامنا ہو ہی گا اور) جو میرے خاص ایمان والے بندے ہیں (ان کو اس کفرِ نعمت کے وبال پر متنبہ کر کے اس سے محفوظ رکھنے کے لئے) ان سے کہہ دیجئے کہ وہ (نعمتِ الٰہی کے اس طرح شکر گذار رہیں کہ) نماز کی پابندی رکھیں اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے (حسب قواعد شرعیہ) پوشیدہ اور آشکارا (جیسا موقع ہو) خرچ کیا کریں ایسے دن کے آنے سے پہلے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی اور نہ دوستی ہو گی (مطلب یہ کہ عباداتِ بدنیہ و مالیہ کو ادا کرتے رہیں کہ یہی شکر ہے نعمت کا) اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس پانی سے پھلوں کی قسم سے تمہارے لئے رزق پیدا کیا اور تمہارے نفع کے واسطے کشتی (اور جہاز) کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا تاکہ وہ خدا کے حکم (و قدرت) سے دریا میں چلے (اور تمہاری تجارت اور سفر کی غرض حاصل ہو) اور تمہارے نفع کے واسطے نہروں کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا (تاکہ اسی سے پانی پیو اور آب پاشی کرو اور اس میں کشتی چلاؤ) اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا جو ہمیشہ چلنے ہی میں رہتے ہیں (تاکہ تم کو روشنی اور گرمی وغیرہ کا فائدہ ہو) اور تمہارے نفع کے واسطے رات اور دن کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا (تاکہ تم کو معیشت اور آسائش کا نفع حاصل ہو) اور جو جو چیز تم نے مانگی (اور

وہ تمہارے مناسبِ حال ہوئی، تم کو ہر چیز دی اور (اشیائے مذکورہ ہی پر کیا منحصر ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں (تو اس قدر بے شمار ہیں کہ) اگر (ان کو) شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لا سکتے (مگر) سچ یہ ہے کہ آدمی بہت ہی بے انصاف بڑا ہی ناشکرا ہے (اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر اور شکر نہیں کرتا، بلکہ اور بالعکس کفر و معصیت کرنے لگتا ہے، جیسا اوپر آیا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا)۔

معارف و مسائل

سورۂ ابراہیم کے شروع میں رسالت و نبوت اور معاد و آخرت کے متعلق مضامین تھے اس کے بعد توحید کی فضیلت اور کلمۂ کفر و شرک کی مذمت کا بیان مثالوں کے ذریعہ کیا گیا، پھر مشرکین کی مذمت اس بات پر کی گئی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے ناشکری اور کفر کا راستہ اختیار کیا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں کفار و مشرکین کی مذمت اور ان کے انجام بد کا ذکر ہے، دوسری آیت میں مؤمنین کی فضیلت اور ان کو ادائے شکر کے لئے کچھ احکام الٰہیہ کی تاکید کی گئی ہے، تیسری، چوتھی اور پانچویں آیات میں اللہ جل شانہٗ کی عظیم نعمتوں کا ذکر فرما کر اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں صرف نہ کریں۔

تفسیر و تشریح اَنْدَاد، نِدّ کی جمع ہے، جس کے معنی مثل اور برابر کے ہیں، بتوں کو انداد اس لئے کہا جاتا ہے کہ مشرکین نے ان کو اپنے عمل میں خدا کی مثل یا برابر قرار دے رکھا تھا، تمتّع کے معنی کسی چیز سے چند روزہ عارضی فائدہ حاصل کرنے کے ہیں، اس آیت میں مشرکین کے اس غلط نظریہ پر نکیر ہے کہ انھوں نے بتوں کو خدا کے مثل اور اس کا شریک ٹھہرا دیا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ان لوگوں کو جتلا دیں کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے فرمایا کہ چند روزہ دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھا لو، مگر تمہارا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔

دوسری آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ (کفار مکہ نے تو اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل ڈالا اب) آپ میرے مؤمن بندوں سے فرما دیں کہ نماز کی پابندی کیا کریں اور ہم نے جو رزق ان کو دیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں، پوشیدہ اور علانیہ طور پر۔ اس آیت میں مؤمن بندوں کے لئے بڑی بشارت اور اعزاز ہے، اوّل تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا بندہ کہہ کر پکارا، پھر صفت ایمان کے ساتھ موصوف کیا، پھر ان کو دائمی راحت اور اعزاز دینے کی ترکیب بتلائی، کہ نماز کی پابندی کریں، نہ اس کے اوقات میں سستی کریں،

نہ آداب میں کوتاہی، اور اللہ ہی کے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ اس کی راہ میں بھی خرچ کیا کریں خرچ کرنے کی دونوں صورتوں کو جائز قرار دیا کہ پوشیدہ طور پر صدقہ خیرات کریں یا اعلان و اظہار کے ساتھ کریں، بعض علماء نے فرمایا کہ زکوٰۃ فرض، صدقۂ الفطر وغیرہ علانیہ ہونے چاہئیں تاکہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو، اور نفلی صدقہ خیرات کو پوشیدہ دینا بہتر ہے کہ نام و نمود کا خطرہ نہ رہے، اور اصل مدار نیت اور حالات پر ہے، اگر اعلان و اظہار میں نام و نمود کا شائبہ آجائے تو صدقہ کی فضیلت ختم ہو جاتی ہے خواہ فرض ہو یا نفل اور اگر نیت یہ ہو کہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو تو فرض اور نفل دونوں میں اعلان و اظہار جائز ہے۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ لفظ خِلَالٌ، خُلَّةٌ کی جمع بھی ہو سکتی ہے، جس کے معنی بے غرض دوستی کے ہیں، اور اس لفظ کو باب مفاعلۃ کا مصدر بھی کہہ سکتے ہیں، جیسے قِتَال، دِفَاع وغیرہ اس صورت میں اس کے معنی دو شخصوں کے آپس میں دونوں طرف سے مخلصانہ دوستی کرنے کے ہوں گے، اس جملہ کا تعلق اوپر کے بیان کئے ہوئے دونوں حکم یعنی نماز اور صدقہ کے ساتھ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آج تو اللہ تعالیٰ نے طاقتِ فرصت عطا فرما رکھی ہے کہ نماز ادا کریں، اور اگر پچھلی عمر میں غفلت سے کوئی نماز رہ گئی ہو تو اس کی قضا کریں، اسی طرح آج مال تمہاری ملک اور قبضہ میں ہے اس کو اللہ کے لئے خرچ کر کے دائمی زندگی کا کام بنا سکتے ہو، لیکن وہ دن قریب آنے والا ہے جب کہ یہ دونوں قوتیں اور قدرتیں تم سے لے لی جائیں گی، نہ تمہارے بدن نماز پڑھنے کے قابل رہیں گے، نہ تمہاری ملک اور قبضہ میں کوئی مال رہے گا جس سے ضائع شدہ حقوق کی ادائیگی کر سکو، اور اس دن میں کوئی بیع و شراء اور خرید و فروخت بھی نہ ہو سکے گی، کہ آپ کوئی ایسی چیز خرید لیں جس کے ذریعہ اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کا کفارہ کر سکیں، اور اس دن میں آپس کی دوستیاں اور تعلقات بھی کام نہ آسکیں گے، کوئی عزیز دوست کسی کے گناہوں کا بار نہ اٹھا سکے گا اور نہ اس کے عذاب کو کسی طرح ہٹا سکے گا۔

اُس دن سے مراد بظاہر حشر و قیامت کا دن ہے، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ موت کا دن ہو، کیونکہ یہ سب آثار موت ہی کے وقت سے ظاہر ہو جاتے ہیں، نہ بدن میں کسی عمل کی صلاحیت رہتی ہے، نہ مال ہی اس کی ملک میں رہتا ہے۔

احکام و ہدایات اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ قیامت کے روز کسی کی دوستی کسی کے کام نہ آئے گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ محض دنیاوی دوستیاں اس روز کام نہ آئیں گی، لیکن جن لوگوں کی دوستی اور تعلقات اللہ کے لئے اور اس کے دین کے

کاموں کے لئے ہوں ان کی دوستی اس وقت بھی کام آئے گی کہ اللہ کے نیک اور مقبول بندے دوسروں کی شفاعت کریں گے جیسا کہ احادیث کثیرہ میں منقول ہے، اور قرآن عزیز میں ارشاد ہے اَلْاَخِلَّاۗءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ "یعنی وہ لوگ جو دنیا میں باہم دوست تھے، اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، کہ یہ چاہیں گے کہ دوست پر اپنا گناہ ڈال کر خود بری ہو جائیں، مگر وہ لوگ جو تقویٰ شعار ہیں، کیونکہ اہل تقویٰ وہاں بھی ایک دوسرے کی مدد بطریق شفاعت کر سکیں گے۔

تیسری، چوتھی اور پانچویں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتوں کی یاد دہانی کرا کے انسان کو اس کی عبادت واطاعت کی طرف دعوت دی گئی ہے، ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے جس پر انسانی وجود کی ابتداء اور بقاء موقوف ہے، پھر آسمان سے پانی اتارا جس کے ذریعہ طرح طرح کے ثمرات پیدا کئے "تاکہ وہ تمہارا رزق بن سکیں" لفظ ثمرات، ثمرہ کی جمع ہے، ہر چیز سے حاصل ہونے والے نتیجہ کو اس کا ثمرہ کہا جاتا ہے، اس لئے لفظ ثمرات میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو انسان کی غذا بنتی ہیں، اور وہ چیزیں بھی جو اس کا لباس بنتی ہیں، اور وہ چیزیں بھی جو اس کے رہنے سہنے کا مکان بنتی ہیں، کیونکہ لفظ رزق جو اس آیت میں مذکور ہے وہ ان تمام ضروریات انسانی پر حاوی اور شامل ہے (مظہری)

پھر فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ ہی نے کشتیوں اور جہازوں کو تمہارے کام میں لگا دیا کہ وہ اللہ کے حکم سے دریاؤں میں چلتے پھرتے ہیں، لفظ سخّر جو اس آیت میں آیا ہے اس سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کا استعمال تمہارے لئے آسان کر دیا ہے، لکڑی، لوہا اور ان سے کشتی جہاز بنانے کے اوزار و آلات اور ان سے صحیح کام لینے کی عقل و دانش یہ سب چیزیں اسی کی دی ہوئی ہیں اس لئے ان چیزوں کے موجد اس پر ناز نہ کریں کہ یہ ہم نے ایجاد کی یا بنائی ہے، کیونکہ جن چیزوں سے اُن میں کام لیا گیا ہے ان میں کوئی چیز بھی تم نے پیدا کی ہے نہ کر سکتے ہو، خالق کائنات کی بنائی ہوئی لکڑی، لوہے، تانبے اور پیتل ہی میں تصرفات کر کے یہ ایجاد کا سہرا آپ نے اپنے سر لیا ہے، ورنہ حقیقت دیکھو تو خود آپ کا اپنا وجود اپنے ہاتھ پاؤں، اپنا دماغ اور عقل بھی تو آپ کی بنائی ہوئی نہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا، کہ یہ دونوں ہمیشہ ایک حالت پر چلتے ہی رہتے ہیں، دَاۗىِٕـبَيْنِ، دَأب سے مشتق ہے، جس کے معنی عادت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں چلنا ان دونوں سیاروں کی عادت بنا دی گئی کہ کبھی اس کے خلاف نہیں ہوتا، مسخر کرنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ تمہارے حکم اور اشاروں پر چلا کریں،

کیونکہ اگر شمس و قمر کو اس طرح انسان کا مسخر کر دیا جاتا کہ وہ انسانی حکم کے تابع چلا کرتے تو انسانوں کے باہمی اختلاف کا یہ نتیجہ ہوتا کہ ایک انسان کہتا کہ آج آفتاب دو گھنٹے بعد نکلے، کیونکہ رات میں کام زیادہ ہے، دوسرا چاہتا کہ دو گھنٹے پہلے نکلے کہ دن کے کام زیادہ ہیں، اس لئے رب العزت جل شانہٗ نے آسمان اور ستاروں کو انسان کا مسخر تو بنایا، مگر اس معنی سے مسخر کیا کہ وہ ہر وقت ہر حال میں حکمت خداوندی کے ماتحت انسان کے کام میں لگے ہوئے ہیں، یہ نہیں کہ ان کا طلوع وغروب اور رفتار انسان کی مرضی کے تابع ہو جائے۔

اسی طرح یہ ارشاد کہ ہم نے رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کر دیا، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان دونوں کو انسان کی خدمت اور راحت کے کام میں لگا دیا۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ "یعنی اللہ تعالیٰ نے دیا تم کو ہر اس چیز میں سے جو تم نے مانگی" اگرچہ اللہ تعالیٰ کی عطاء اور بخشش کسی کے مانگنے پر موقوف نہیں، ہم نے تو اپنا وجود بھی نہیں مانگا تھا، اسی نے اپنے فضل سے بے مانگے عطا فرمایا ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود ٭ لطفِ تو ناگفتۂ ما می شنود

اسی طرح آسمان، زمین، چاند، سورج، وغیرہ پیدا کرنے کی دعا کس نے مانگی تھی، یہ سب کچھ مالک نے بے مانگے ہی دیا ہے، اسی لئے قاضی بیضاوی نے اس لفظ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ہر وہ چیز دیدی جو مانگنے کے قابل ہے، اگرچہ تم نے مانگا نہ ہو لیکن اگر الفاظ کے ظاہری معنی ہی مراد ہوں تو ان میں بھی کچھ اشکال نہیں کہ عموماً انسان جو کچھ مانگتا اور طلب کرتا ہے اکثر تو اس کو دے ہی دیا جاتا ہے، اور جہاں کہیں اس کا سوال اپنی ظاہری صورت میں پورا نہیں کیا جاتا اس میں اس شخص کے لئے یا پورے عالم کے لئے کوئی مصلحت ہوتی ہے جس کا اس کو علم نہیں ہوتا، مگر علیم و خبیر جانتے ہیں کہ اگر اس کا یہ سوال پورا کر دیا گیا تو خود اس کے لئے یا اس کے خاندان کے لئے یا پورے عالم کے لئے وبال جان بنجاتا، ایسی صورت میں سوال کا پورا نہ کرنا ہی بڑی نعمت ہوتی ہے، مگر انسان اپنے قصور علم کی وجہ سے اس کو نہیں جانتا، اس لئے غمگین ہوتا ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا "یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں انسان پر اس قدر ہیں کہ سب انسان مل کر ان کو شمار کرنا چاہیں تو شمار میں بھی نہیں آسکتیں، انسان کا اپنا وجود خود ایک عالم اصغر ہے، اس کی آنکھ، ناک، کان اور ہاتھ پاؤں اور بدن کے ہر جوڑ بلکہ ہر رگ و ریشہ میں رب العزت کی غیر متناہی نعمتیں مستور ہیں جن سے یہ چلتی پھرتی سیکڑوں نازک مشینوں کی عجیب و غریب فیکٹری ہر وقت مشغول بکار ہے، پھر آسمان و

زمین اور دونوں کی مخلوقات سمندروں پہاڑوں کی مخلوقات کہ آج کی جدید تحقیقات اور اس میں عمریں کھپانے والے ہزاروں ماہرین بھی ان کا احاطہ نہیں کر سکے، پھر نعمتیں صرف وہی نہیں جو مثبت صورت میں عام طور پر نعمت سمجھی جاتی ہیں، بلکہ ہر مرض، ہر تکلیف، ہر مصیبت ہر رنج و غم سے محفوظ رہنا الگ الگ مستقل نعمت ہے، ایک انسان کو کتنی قسم کی بیماریاں اور کتنی اقسام کی بدنی اور ذہنی تکلیفیں دنیا میں پیش آسکتی ہیں انہی کا شمار ایک انسان سے نہیں ہو سکتا، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پورے عطیات اور نعمتوں کا شمار کس سے ہو سکتا ہے۔

انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ بے شمار نعمتوں کے بدلہ میں بے شمار عبادات اور بے شمار شکر لازم ہوتا، مگر اللہ جل شانہ نے ضعیف البنیان انسان کی رعایت فرمائی، جب وہ حقیقت پر نظر کر کے یہ اعتراف کرلے کہ شکر واجب سے سبکدوش ہونا اس کی قدرت میں نہیں، تو اسی اعتراف کو ادائے شکر کے قائم مقام قرار دیدیا ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے ہی اعتراف پر ارشاد فرمایا کہ الآن قد شکرت یا داؤد، یعنی یہ اعتراف کرلینا ہی ادائے شکر کے لئے کافی ہے۔

آخر آیت میں فرمایا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ، یعنی انسان بہت بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے، یعنی مقتضیٰ انصاف کا تو یہ تھا کہ کوئی تکلیف و مصیبت پیش آئے تو صبر و سکون سے کام لے، زبان اور دل کو شکایت سے پاک رکھے، اور سمجھے کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے ایک حاکم حکیم کی طرف سے آیا ہے، وہ بھی مقتضائے حکمت ہونے کی بناء پر ایک نعمت ہی ہے، اور جب کوئی راحت و نعمت ملے تو دل اور زبان ہر عمل سے اس کا شکر گذار ہو، مگر عام انسانوں کی عادت اس سے مختلف ہے کہ ذرا مصیبت و تکلیف پیش آجائے، تو بے صبری میں مبتلا ہو جائیں، اور کہتے پھریں، اور ذرا نعمت و دولت مل جائے تو اس میں مست ہو کر خدا تعالیٰ کو بھلا دیں، اسی لئے مؤمنین مخلصین کی صفت پچھلی آیت میں صبّار اور شکور بتلائی گئی ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَ

اور جس وقت کہا ابراہیم نے اے رب کردے اس شہر کو امن والا اور دور رکھ مجھ کو اور

بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ

میری اولاد کو اس بات سے کہ ہم پوجیں مورتوں کو، اے رب انھوں نے گمراہ کیا بہت

النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾

لوگوں کو سو جس نے پیروی کی میری سو وہ تو میرا ہے اور جس نے میرا کہنا نہ مانا سو تو بخشنے والا مہربان ہے،

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ

اے رب میں نے بسایا ہے اپنی ایک اولاد کو میدان میں کہ جہاں کھیتی نہیں تیرے محترم گھر کے

الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ

پاس، اے رب ہمارے تاکہ قائم رکھیں نماز کو سو رکھ لچھے لوگوں کے دل کہ

تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾

مائل ہوں اُن کی طرف اور روزی دے ان کو میووں سے شاید وہ شکر کریں

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ

اے رب ہمارے تو تو جانتا ہے جو کچھ ہم کرتے ہیں چھپا کر اور جو کچھ کرتے ہیں دکھا کر اور مخفی نہیں اللہ پر کوئی

شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ﴿۳۸﴾ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ

چیز زمین میں اور نہ آسمان میں، شکر ہے اللہ کا جس نے بخشا

لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ﴿۳۹﴾

مجھ کو اتنی بڑی عمر میں اسمٰعیل اور اسحٰق، بیشک میرا رب سنتا ہے دعا کو

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ

اے رب میرے کر مجھ کو کہ قائم رکھوں نماز اور میری اولاد میں سے بھی اے رب میرے اور قبول

دُعَاۗءِ ﴿۴۰﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ

کر میری دعا، اے ہمارے رب بخش مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور سب ایمان والوں کو جس

يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾	
دن قائم ہو حساب۔	

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جب کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے (حضرت

اسمٰعیل اور حضرت ہاجرہ کو بحکمِ الٰہی میدانِ مکہ میں لاکر رکھنے کے وقت دعاء کے طور پر) کہا کہ اے میرے رب اس شہر (مکہ) کو امن والا بنا دیجئے (کہ اس کے رہنے والے مستحق امن رہیں، یعنی حرم کر دیجئے) اور مجھ کو اور میرے خاص فرزندوں کو بتوں کی عبادت سے (جو کہ اس وقت جہلاء میں شائع ہے) بچائے رکھئے (جیسا اب تک بچائے رکھا) اے میرے پروردگار (میں بتوں کی عبادت سے بچنے کی دعاء اس لئے کرتا ہوں کہ) ان بتوں نے بہتیرے آدمیوں کو گمراہ کر دیا، (یعنی ان کی گمراہی کا سبب ہو گئے، اس لئے ڈر کر آپ کی پناہ چاہتا ہوں اور میں جس طرح اولاد کے بچنے کی دُعاء کرتا ہوں، اسی طرح ان کو بھی کہتا سنتا رہوں گا) پھر (میرے کہنے سننے کے بعد) جو شخص میری راہ پر چلے گا وہ تو میرا ہے (اور اس کے لئے دعاءِ مغفرت ہے ہی) اور جو شخص (اس باب میں) میرا کہنا نہ مانے (سو اس کو آپ ہدایت فرمائیے، کیونکہ) آپ تو کثیر المغفرت (اور) کثیر الرحمۃ ہیں (ان کی مغفرت اور رحمت کا سامان بھی کر سکتے ہیں کہ ان کو ہدایت دیں مقصود اس دعاء سے شفاعت مؤمنین کے لئے اور طلبِ ہدایت غیر مؤمنین کے لئے ہے) اے ہمارے رب میں اپنی اولاد کو (یعنی اسمٰعیل علیہ السلام کو اور ان کے واسطے سے ان کی نسل کو) آپ کے معظم گھر (یعنی خانۂ کعبہ) کے قریب (جو کہ پہلے سے یہاں بنا ہوا تھا اور ہمیشہ سے لوگ اس کا ادب کرتے آئے تھے) ایک (چھوٹے سے) میدان میں جو (بوجہ سنگستان ہونے کے) زراعت کے قابل (بھی) نہیں آباد کرتا ہوں اے ہمارے رب (بیت المحرام کے پاس اس لئے آباد کرتا ہوں) تاکہ وہ لوگ نماز کا (خاص) اہتمام رکھیں (اور چونکہ یہ اس وقت چھوٹا سا میدان ہے) تو آپ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے (کہ یہاں آکر رہیں سہیں تاکہ آبادی پر رونق ہو جاوے) اور (چونکہ یہاں زراعت وغیرہ نہیں ہے اس لئے) ان کو (محض اپنی قدرت سے) پھل کھانے کو دیجئے تاکہ یہ لوگ (ان نعمتوں کا) شکر کریں، اے ہمارے رب (یہ دعائیں محض اپنی بندگی اور حاجتمندی کے اظہار کے لئے ہیں آپ کو اپنی حاجت کی اطلاع کے لئے نہیں، کیونکہ) آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے، جو ہم اپنے دل میں رکھیں اور جو ظاہر کر دیں اور (ہمارے ظاہر و باطن پر کیا حصر ہے) اللہ تعالیٰ سے (تو) کوئی چیز بھی مخفی نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں (کچھ دعائیں آگے آئیں گی اور بیچ میں بعض نعم سابقہ پر حمد و شکر کیا، تاکہ شکر کی برکت سے یہ دعائیں اقرب الی القبول ہو جائیں، چنانچہ فرمایا) تمام حمد (و ثناء) خدا کے لئے (سزاوار) ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق (دو بیٹے) عطا فرمائے، حقیقت میں میرا رب دعاء کا بڑا سننے والا (یعنی قبول کرنے والا) ہے (کہ عطائے اولاد کے متعلق میری یہ دعاء رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ قبول کر لی، پھر اس نعمت کا شکر ادا کر کے آگے بقیہ

دعائیں پیش کرتے ہیں) اے میرے رب (جو میری نیت ہے اپنی اولاد کو بیت محرم کے پاس بسانے سے کہ وہ نمازوں کا اہتمام رکھیں اس کو پورا کر دیجئے، اور جیسا اُن کے لئے اہتمامِ نماز میرا مطلوب ہے اسی طرح اپنے لئے بھی مطلوب ہے، اس لئے اپنے اور ان کے دونوں کے لئے دعاء کرتا ہوں اور چونکہ مجھ کو وحی سے معلوم ہو گیا ہے کہ ان میں بعض غیر مؤمن بھی ہوں گے اس لئے دعاء سب کے لئے نہیں کر سکتا ہوں، پس ان مضامین پر نظر کر کے یہ دعاء کرتا ہوں کہ) مجھ کو بھی نماز کا (خاص) اہتمام کرنے والا رکھئے، اور میری اولاد میں بھی بعضوں کو (نماز کا اہتمام رکھنے والا کیجئے) اے ہمارے رب اور میری (یہ) دعاء قبول کیجئے (اور) اے ہمارے رب میری مغفرت کر دیجئے اور میرے ماں باپ کی بھی اور کل مؤمنین کی بھی حساب قائم ہونے کے دن (یعنی قیامت کے روز سب مذکورین کی مغفرت کر دیجئے)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں عقیدۂ توحید کی معقولیت اور اہمیت کا اور شرک کی جہالت اور مذمت کا بیان تھا، توحید کے معاملہ میں زمرۂ انبیاء علیہم السلام میں سب سے زیادہ کامیاب جہاد حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کا جہاد تھا، اسی لئے دین ابراہیمی کو خاص طور پر دینِ حنیف کا نام دیا جاتا ہے۔

اسی مناسبت سے یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کا ذکر آیات مذکورہ میں کیا گیا ہے، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پچھلی ایک آیت اَلَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا میں قریشِ مکہ کے ان لوگوں کی مذمت بیان کی گئی تھی جنھوں نے تقلیدِ آبائی کی بناء پر ایمان کو کفر سے اور توحید کو شرک سے بدل ڈالا تھا، ان آیات میں ان کو بتلایا گیا کہ تمھارے جدِ امجد ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ اور عمل کیا تھا تاکہ تقلید آبائی کے خوگر اسی پر نظر کر کے اپنے کفر سے باز آجائیں (بحر محیط)

اور یہ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے قصص اور حالات کے بیان سے قرآن کریم کا مقصد صرف ان کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہوتا، بلکہ ان میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق ہدایتی اصول ہوتے ہیں، انہی کو جاری رکھنے کے لئے یہ واقعات قرآن میں بار بار دُہرائے جاتے ہیں۔

اس جگہ پہلی آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی دو دعائیں مذکور ہیں، اوّل رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا، یعنی اے میرے پروردگار اس شہر (مکہ) کو جائے امن بنا دیجئے، سورۂ

بقرہ میں بھی یہی دعاء مذکور ہے، مگر اس میں لفظ بلد بغیر الف لام کے بَلَدًا فرمایا ہے، جس کے معنی غیر متعین شہر کے ہیں، وجہ یہ ہے کہ وہ دعاء اُس وقت کی تھی جبکہ شہر مکہ کی بستی آباد نہ تھی، اس لئے عام الفاظ میں یہ دعا کی کہ اس جگہ کو ایک شہر مامون بنا دیجئے۔

اور دوسری دعاء اس وقت کی ہے جبکہ مکہ کی بستی بس چکی تھی، تو شہر مکہ کو متعین کر کے دعاء فرمائی، کہ اس کو جائے امن بنا دیجئے، دوسری دعاء یہ فرمائی کہ مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائیے۔

انبیاء علیہم السلام اگرچہ معصوم ہوتے ہیں ان سے شرک و بت پرستی بلکہ کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا، مگر یہاں حضرت خلیلؑ نے اس دُعاء میں اپنے آپ کو بھی شامل فرمایا ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ طبعی خوف کے اثر سے انبیاء بھی ہر وقت اپنے کو خطرہ میں محسوس کرتے رہتے ہیں، یا یہ کہ اصل مقصود اپنی اولاد کو شرک و بت پرستی سے بچانے کی دعا کرنا تھا، اولاد کو اس کی اہمیت سمجھانے کے لئے اپنے آپ کو بھی شاملِ دعاء فرما لیا۔

اللہ جل شانہٗ نے اپنے خلیل کی دُعاء قبول فرمائی ان کی اولاد شرک و بت پرستی سے محفوظ رہی، اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اہلِ مکہ تو عموماً اولادِ ابراہیم علیہ السلام ہیں، ان میں تو بت پرستی موجود تھی، بحر محیط میں اس کا جواب بحوالہ سفیان بن عیینہؒ یہ دیا ہے کہ اولادِ اسمٰعیل علیہ السلام میں کسی نے درحقیقت بت پرستی نہیں کی، بلکہ جس وقت مکہ پر قوم جرہم کے لوگوں نے قبضہ کر کے اولادِ اسمٰعیل علیہ السلام کو حرم سے نکال دیا، تو یہ لوگ حرم سے انتہائی محبت و عظمت کی بناء پر یہاں کے کچھ پتھر اپنے ساتھ اُٹھا لے گئے تھے، ان کو حرم محترم اور بیت اللہ کی یادگار کے طور پر سامنے رکھ کر عبادت اور اس کے گرد طواف کیا کرتے تھے جس میں کسی غیر اللہ کی طرف کوئی رُخ نہ تھا، بلکہ جس طرح بیت اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا یا بیت اللہ کے گرد طواف کرنا اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت ہے، اسی طرح وہ اس پتھر کی طرف رُخ اور اس کے گرد طواف کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے منافی نہ سمجھتے تھے، اس کے بعد یہی طریقہ کار بت پرستی کا سبب بن گیا۔

دوسری آیت میں اپنی اس دعاء کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ بت پرستی سے ہم اس لئے پناہ مانگتے ہیں کہ ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیا ہے، یہ اس لئے فرمایا کہ حضرت ابراہیم السلام اپنے والد اور قوم کا تجربہ کر چکے تھے کہ بت پرستی کی رسم نے ان کو ہر خیر و صلاح سے محروم کر دیا۔

آخر آیت میں فرمایا فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

"یعنی ان میں سے جو شخص میرا اتباع کرے یعنی ایمان اور عمل صالح کا پابند ہو جائے وہ تو میرا ہی ہے، مطلب یہ ہے کہ اس پر فضل و کرم کی امید تو ظاہر ہے، اور جو شخص میری نافرمانی کرے تو آپ بہت مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں" اس میں نافرمانی سے اگر صرف عملی نافرمانی یعنی بدعملی مراد لی جائے تو معنی ظاہر ہیں، کہ آپ کے فضل سے ان کی بھی مغفرت کی امید ہے، اور اگر نافرمانی سے مرادِ کفر و انکار لیا جائے تو یہ ظاہر ہے کہ کافر و مشرک کی مغفرت نہ ہونے اور ان کی شفاعت نہ کرنے کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے ہو چکا تھا پھر ان کی مغفرت کی امید کا اظہار کرنا درست نہیں ہو سکتا، اس لئے بحر محیط میں فرمایا کہ اس جگہ حضرت خلیل علیہ السلام نے ان کی سفارش یا دعاء کے الفاظ نہیں اختیار کئے، یہ نہیں فرمایا کہ آپ ان کی مغفرت کر دیں، البتہ پیغمبرانہ شفقت جس کے دامن میں کافر بھی رہتے ہیں اور ہر پیغمبر کی دلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ کوئی کافر بھی عذاب میں مبتلا نہ ہو اپنی اس طبعی خواہش کا اظہار اس عنوان سے کر دیا کہ "آپ تو بڑے غفور و رحیم ہیں" یوں نہیں فرمایا کہ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرمائیں، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے کافروں کے بارے میں فرمایا وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ، یعنی اگر آپ ان کی مغفرت فرمائیں تو آپ قوی اور حکمت والے ہیں سب کچھ کر سکتے ہیں کوئی روکنے والا نہیں"

ان دونوں بزرگوں نے کافروں کے معاملہ میں سفارش پر اقدام تو اس لئے نہیں کیا کہ وہ ادبِ حق کے خلاف تھا، مگر یہ بھی نہیں فرمایا کہ ان کافروں پر آپ عذاب نازل کر دیں بلکہ ادب کے ساتھ ایک خاص عنوان سے ان کے بھی بخشے جانے کی طبعی خواہش کا اظہار کر دیا۔

احکام و ہدایات

دعاء تو ہر انسان مانگتا ہے، مگر مانگنے کا سلیقہ ہر ایک کو نہیں ہوتا انبیاء علیہم السلام کی دعائیں سبق آموز ہوتی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا چیز مانگنے کی ہے، اس دعائے ابراہیمی کے دو جز ہیں، ایک شہر مکہ کو خوف و خطر سے آزاد جائے امن بنا دینا، دوسرے اپنی اولاد کو بت پرستی سے ہمیشہ کے لئے نجات دلانا۔

غور سے کام لیا جائے تو انسان کی صلاح و فلاح کے یہی دو بنیادی اصول ہیں، کیونکہ انسانوں کو اگر اپنے رہنے سہنے کی جگہ میں خوف و خطر اور دشمنوں کے حملوں سے امن و اطمینان نہ ہو تو نہ دنیوی اور مادی اعتبار سے ان کی زندگی خوشگوار ہو سکتی ہے اور نہ دینی اور روحانی اعتبار سے، دنیا کے سارے کاموں اور راحتوں کا مدار تو امن و اطمینان پر ہونا ظاہر ہی ہے، جو شخص دشمنوں کے نرغوں اور مختلف قسم کے خطروں میں گھرا ہوا ہو اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کھانے پینے، سونے جاگنے کی بہترین آسانیاں، اعلیٰ قسم کے محلات اور بنگلے، مال و دولت

کی ہبتات سب تلخ ہو جاتی ہیں۔

دینی اعتبار سے بھی ہر طاعت و عبادت اور احکامِ الٰہیہ کی تعمیل انسان اسی وقت کر سکتا ہے جب اس کو کچھ سکون و اطمینان نصیب ہو۔

اس لئے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی پہلی دعاء میں انسانی فلاح کی تمام ضروریات معاشی و اقتصادی اور دینی و اخروی سب داخل ہو گئیں، اس ایک جملہ سے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کے لئے دنیا کی تمام اہم چیزیں مانگ لیں۔

اس دعاء سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اولاد کی ہمدردی اور ان کی معاشی راحت کا انتظام بھی حسبِ قدرت باپ کے فرائض میں سے ہے، اس کی کوشش زہد اور ترکِ دنیا کے منافی نہیں۔

دوسری دعاء میں بھی بڑی جامعیت ہے، کیونکہ وہ گناہ جس کی مغفرت کا امکان نہیں، وہ شرک و بت پرستی ہے اس سے محفوظ رہنے کی دعاء فرما دی، اس کے بعد اگر کوئی گناہ سرزد بھی ہو جائے تو اس کا کفارہ دوسرے اعمال سے بھی ہو سکتا ہے، اور کسی کی شفاعت سے بھی معاف کئے جا سکتے ہیں، اور اگر عبادتِ اصنام کا لفظ صوفیائے کرام کے اقوال کے مطابق اپنے وسیع مفہوم میں لیا جائے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ سے غافل کرے وہ اس کا بت ہے، اور اس کی محبت سے مغلوب ہو کر خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر اقدام کر لینا ایک طرح سے اس کی عبادت ہے، تو اس دعاء یعنی عبادتِ اصنام سے محفوظ رہنے میں تمام گناہوں سے حفاظت کا مضمون آجاتا ہے، بعض صوفیائے کرام نے اسی معنی میں اپنے نفس کو خطاب کر کے غفلت و معصیت پر ملامت کی ہے ؎

سودہ گشت از سجدۂ راہِ بتاں پیشانیم
چند بر خود تہمتِ دینِ مسلمانی نہم

اور عارف رومیؒ نے فرمایا ہے ؎

ہر خیالِ شہوتے در رہ بتے ست

تیسری آیت میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک اور حکیمانہ دعاء اس طرح مذکور ہے کہ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ الآیۃ اے میرے پروردگار! میں نے اپنی کچھ ذریت یعنی اہل و عیال کو ایک ایسے دامنِ کوہ میں ٹھہرا دیا ہے جس میں کوئی کھیتی وغیرہ نہیں ہو سکتی (اور بظاہر وہاں زندگی کا کوئی سامان نہیں) یہ دامنِ کوہ آپ کے عظمت والے گھر کے پاس ہے، تاکہ یہ لوگ نماز قائم کریں، اس لئے آپ کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دیں، کہ ان کے انس اور آبادی کا سامان ہو جائے، اور ان کو ثمرات (پھل) عطا فرمائیے تاکہ

یہ لوگ شکر گذار ہوں۔

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس دعاء کا واقعہ یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر جو طوفانِ نوح میں بے نشان ہو گئی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اس کی دوبارہ تعمیر کا ارادہ فرمایا تو اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو اس کے لئے منتخب فرما کر ان کو ملکِ شام سے ہجرت کر کے حضرت ہاجرہؑ اور صاحبزادے اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ اس بے آب و گیاہ مقام کو مسکن بنانے کے لئے مامور فرمایا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام اس وقت شیر خوار بچے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حسبِ حکم ان کو اور ان کی والدہ ہاجرہ کو موجودہ بیت اللہ اور چاہِ زمزم کے قریب ٹھہرا دیا، اس وقت یہ جگہ پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک چٹیل میدان تھی، دور دور تک دیانی نہ آبادی، ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لئے ایک توشہ دان میں کچھ کھانا اور ایک مشکیزہ میں پانی رکھ دیا تھا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکِ شام کی طرف واپس ہونے کا حکم ملا، جس جگہ حکم ملا تھا وہیں سے تعمیلِ حکم کے لئے روانہ ہو گئے، بیوی اور شیر خوار بچہ کو اس لق و دق جنگل میں چھوڑنے کا جو طبعی اور فطری اثر تھا اس کا اظہار تو اس دعاء سے ہو گا جو بعد میں کی گئی مگر حکمِ ربانی کی تعمیل میں اتنی دیر بھی گوارا نہیں فرمائی کہ حضرت ہاجرہ کو خبر دیدیں، اور کچھ تسلی کے الفاظ کہدیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت ہاجرہ نے ان کو جاتے ہوئے دیکھا تو بار بار آوازیں دیں کہ اس جنگل میں آپ ہمیں کس پر چھوڑ کر جا رہے ہیں، جہاں نہ کوئی انسان ہے نہ زندگی کا سامان، مگر خلیل اللہ نے مڑ کر نہیں دیکھا، تب حضرت ہاجرہ کو خیال آیا کہ اللہ کا خلیل ایسی بے وفائی نہیں کر سکتا، شاید اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ملا ہے، تو آواز دے کر پوچھا کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے، تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مڑ کر جواب دیا کہ ہاں، حضرت ہاجرہؑ نے یہ سن کر فرمایا اِذًا لَّا يُضَيِّعُنَا، "یعنی اب کوئی پرواہ نہیں، جس مالک نے آپ کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہ کرے گا"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ ایک پہاڑی کے پیچھے پہونچ گئے، جہاں ہاجرہ و اسمٰعیل علیہما السلام آنکھوں سے اوجھل ہو گئے، تو اس وقت بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر یہ دعاء مانگی جو اس آیت میں مذکور ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مذکورہ دعاء کے ضمن میں بہت سی ہدایات اور مسائل ہیں، ان کا بیان یہ ہے :-

دعاءِ ابراہیمی کے اسرار و حکم

(۱) حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک طرف تو مقامِ خلیل الٰہی کا حق ادا کیا، کہ جس وقت اور جس جگہ ان کو یہ حکم ملا کہ آپ ملکِ شام واپس چلے جائیں، اس بے آب و گیاہ لق و دق میدان میں اہلیہ اور شیر خوار بچے کو چھوڑ کر چلے جانے اور حکم ربانی کی تعمیل میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں فرمائی، اس کی تعمیل میں اتنی دیر لگانا بھی گوارا نہیں فرمایا کہ اہلیہ محترمہ کے پاس جا کر تسلی کر دیں، اور کہہ دیں کہ مجھے یہ حکم ملا ہے آپ گھبرائیں نہیں، بلکہ جس وقت جس جگہ حکم ملا فوراً حکم ربانی کی تعمیل کے لئے چل کھڑے ہوئے۔

دوسری طرف اہل و عیال کے حقوق اور ان کی محبت کا یہ حق ادا کیا کہ پہاڑی کے پیچھے ان سے اوجھل ہوتے ہی حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی حفاظت اور امن و اطمینان کے ساتھ رہنے کی دعاء فرمائی، ان کی راحت کا سامان کر دیا، کیونکہ وہ اپنی جگہ مطمئن تھے کہ تعمیل حکم کے ساتھ جو دعاء کی جائے گی بارگاہِ کریم سے وہ ہرگز رد نہ ہوگی، اور ایسا ہی ہوا کہ یہ بیکس و بے بس عورت اور بچہ نہ صرف خود آباد ہوئے، بلکہ ان کے طفیل میں ایک شہر آباد ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ ان کو ضروریاتِ زندگی اطمینان کے ساتھ نصیب ہوئیں بلکہ ان کے طفیل میں آج تک اہلِ مکہ پر ہر طرح کی نعمتوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

یہ ہے پیغمبرانہ استقامت اور حسنِ انتظام کہ ایک پہلو کی رعایت کے وقت دوسرا پہلو کبھی نظر انداز نہیں ہوتا، وہ عام صوفیائے کرام کی طرح مغلوب الحال نہیں ہوتے، اور یہی وہ تعلیم ہے جس کے ذریعہ ایک انسان انسان کامل بنتا ہے۔

(۲) غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا کہ شیر خوار بچے اور اس کی والدہ کو اس خشک میدان میں چھوڑ کر ملکِ شام چلے جائیں تو اسی حکم سے اتنا تو یقین ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ضائع نہ فرمادیں گے بلکہ ان کیلئے پانی ضرور مہیا کیا جائے گا، اس لئے بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ مَاءٍ نہیں کہا، بلکہ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ فرما کر درخواست یہ کی کہ ان کو پھل اور ثمرات عطا ہوں خواہ کسی دوسری جگہ ہی سے لائے جائیں، یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں آج تک بھی کاشت کا کوئی خاص انتظام نہیں، مگر دنیا بھر کے پھل اور ہر چیز کے ثمرات وہاں اتنے پہنچتے ہیں کہ دوسرے بہت سے شہروں میں ان کا ملنا مشکل ہے۔ (بحر محیط)

(۳) عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ سے ثابت ہوا کہ بیت اللہ شریف کی بناء حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہو چکی تھی، جیسا کہ امام قرطبیؒ نے تفسیر سورۂ بقرہ میں متعدد روایات سے ثابت کیا ہے کہ سب سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر آدم علیہ السلام نے کی ہے، جب

ان کو زمین پر اتارا گیا، تو بطور معجزہ جبلِ سراندیپ سے اس جگہ تک ان کو پہونچایا گیا، اور جبرئیل امین نے بیت اللہ کی جگہ کی نشاندہی بھی کی، اس کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی، وہ خود اور ان کی اولاد اس کے گرد طواف کرتے تھے، یہاں تک کہ طوفانِ نوح میں بیت اللہ کو اٹھا لیا گیا اور اس کی بنیادیں زمین میں موجود رہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی نئی تعمیر کا حکم ملا، حضرت جبرئیل امین نے قدیم بنیادوں کی نشان دہی کی، پھر یہ بناءِ ابراہیمی عہدِ جاہلیتِ عرب میں منہدم ہو گئی، تو قریش جاہلیت نے از سرِ نو تعمیر کی، جس کی تعمیر میں ابو طالب کے ساتھ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نبوت سے پہلے حصہ لیا۔

اس میں بیت اللہ کی صفت مُحَرَّمٌ ذکر کی گئی ہے، محرم کے معنی معزز کے بھی ہو سکتے ہیں اور محفوظ کے بھی، بیت اللہ شریف میں یہ دونوں صفتیں موجود ہیں، کہ ہمیشہ معزز اور مکرم رہا ہے، اور ہمیشہ دشمنوں سے محفوظ بھی رہا ہے۔

(۴) لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، حضرت خلیلؑ نے شروع دعاء میں اپنے بچے اور اس کی والدہ کی بے بسی اور خستہ حالی ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے جو دعاء کی وہ یہ کہ ان کو نماز کا پابند بنا دے کیونکہ نماز دنیا و آخرت کی تمام خیرات و برکات کے لئے جامع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کے حق میں اس سے بڑی کوئی ہمدردی اور خیر خواہی نہیں کہ ان کو نماز کا پابند بنا دیا جائے، اور اگرچہ وہاں اُس وقت صرف ایک عورت اور بچہ کو چھوڑا تھا، مگر دعاء میں صیغہ جمع کا استعمال فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ حضرت خلیل علیہ السلام کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہاں شہر آباد ہوگا اور اس بچہ کی نسل چلے گی، اس لئے دعاء میں ان سب کو شریک کر لیا۔

(۵) اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ، اَفْئِدَہ، فُؤَادٌ کی جمع ہے، جس کے معنی دل کے ہیں، اس جگہ لفظ اَفْئِدَہ کو نکرہ اور اس کے ساتھ حرف مِن لایا گیا، جو تبعیض اور تقلیل کے لئے آتا ہے، اس لئے معنی یہ ہوئے کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیجئے، امام تفسیر حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس دعاء میں یہ حرف تبعیض و تقلیل نہ ہوتا بلکہ اَفْئِدَةَ النَّاسِ کہدیا جاتا تو ساری دنیا کے مسلم و غیر مسلم یہود و نصاریٰ اور مشرق و مغرب کے سب آدمی مکہ پر ٹوٹ پڑتے، جو اُن کے لئے باعثِ زحمت ہو جاتا، اس حقیقت کے پیشِ نظر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعاء میں یہ الفاظ فرمائے کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیجئے۔

(۶) وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ، ثَمَرَاتٌ، ثَمَرَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں پھل اور عادۃً ان پھلوں کو کہا جاتا ہے جو کھائے جاتے ہیں، اس اعتبار سے دعاء کا حاصل یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو کھانے کے لئے ہر طرح کے پھل عطا فرمائیے۔

اور کبھی لفظ ثمرہ نتیجہ اور پیداوار کے معنی میں بھی آتا ہے جو کھانے کی چیزوں سے زیادہ عام ہے، ہر نفع آور چیز کے نتیجہ اور حاصل کو اُس کا ثمرہ کہا جا سکتا ہے، مشینوں اور صنعتی کارخانوں کے ثمرات ان کی مصنوعات کہلائیں گی، ملازمت اور مزدوری کا ثمرہ وہ اُجرت اور تنخواہ کہلائیگی جو اس کے نتیجہ میں حاصل ہوئی، قرآن کریم کی ایک آیت میں اس دعاء میں ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ کا لفظ بھی آیا ہے، اس میں لفظ شجر کے بجائے لفظ شَيْءٍ لایا گیا ہے، جس سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ حضرت خلیل اللہؑ نے ان لوگوں کے لئے صرف کھانے کے پھلوں ہی کی دعاء نہیں فرمائی، بلکہ ہر چیز کے ثمرات اور حاصل شدہ نتائج کی دعاء مانگی ہے، جس میں دنیا بھر کی مصنوعات اور ہر طرح کی قابلِ انتفاع چیزیں داخل ہیں، شاید اس دعاء کا یہ اثر ہے کہ مکہ مکرمہ باوجود اس کے کہ کوئی زراعتی ملک ہے نہ تجارتی یا صنعتی، لیکن دنیا بھر کی ساری چیزیں مشرق و مغرب سے پہنچ کر مکہ معظمہ میں آتی ہیں، جو غالباً دنیا کے کسی بڑے سے بڑے شہر کو بھی نصیب نہیں۔

(۷) حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کے لئے یہ دعاء نہیں فرمائی کہ مکہ کی زمین کو قابلِ کاشت بنا دیں، ورنہ کچھ مشکل نہ تھا کہ مکہ کی وادی اور سارے پہاڑ سرسبز کر دیئے جاتے، جن میں باغات اور کھیت ہوتے، مگر خلیل اللہ نے اپنی اولاد کے لئے یہ زراعت کا مشغلہ پسند نہ کیا، اس لئے دعاء فرمائی کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیئے جائیں، جو مشرق و مغرب اور اطرافِ عالم سے یہاں آیا کریں، ان کا یہ اجتماع پوری دنیا کے لئے رشد و ہدایت کا اور اہلِ مکہ کی خوش حالی کا ذریعہ بنے، اطرافِ عالم کی چیزیں بھی یہاں پہونچ جائیں، اور اہلِ مکہ کو کسبِ مال کے ذرائع بھی ہاتھ آجائیں، اللہ تعالیٰ نے یہ دعاء قبول فرمائی، اور آج تک اہلِ مکہ زراعت اور کاشت سے بے نیاز ہو کر تمام ضروریاتِ زندگی سے مالا مال ہیں۔

(۸) لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ، میں اشارہ کر دیا کہ اولاد کے لئے معاشی راحت و سکون کی دعاء بھی اسی لئے کی گئی کہ یہ شکر گذار بن کر اس پر بھی اجر حاصل کریں، اس طرح دعاء کی ابتداء نماز کی پابندی سے ہوئی، اور انتہا شکر گذاری پر، درمیان میں معاشی راحت و سکون کا ذکر آیا، اس میں یہ تعلیم ہے کہ مسلمان کو ایسا ہی ہونا چاہئے، کہ اس کے اعمال و احوال، خیالات و افکار پر آخرت کی فلاح کا غلبہ ہو، اور دنیا کا کام بقدرِ ضرورت ہو۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۝

اس آیت میں دعاء کا تکملہ اللہ جل شانہٗ کے علمِ محیط کا حوالہ دے کر کیا گیا ہے، اور

لفظ رَبَّنَا کو الحاح و زاری کے لئے مکرر لایا گیا ہے، معنی یہ ہیں کہ آپ ہمارے ہر حال سے واقف اور ہماری قلبی باطنی کیفیات اور ظاہری عرض و معروض سب سے باخبر ہیں۔

باطنی کیفیات سے مراد وہ رنج و غم اور فکر ہے جو شیر خوار بچے اور اس کی والدہ کو ایک کھلے میدان میں بے سر و سامان فریاد کرتے ہوئے چھوڑنے اور ان کی جدائی سے فطری طور پر لاحق ہو رہا تھا، اور ظاہری عرض و معروض سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء اور حضرت ہاجرہؑ کے وہ کلمات مراد ہیں جو انھوں نے امرِ الٰہی کی خبر سنکر کہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم کیا ہے تو وہ ہمارے لئے بھی کافی ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہیں کرے گا، آخر آیت میں علمِ الٰہی کی اسی وسعت کا مزید بیان ہے کہ ہمارا ظاہر و باطن ہی کیا، تمام زمین و آسمان میں کوئی چیز اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۝ اس آیت کا مضمون بھی اس دعاء کا تکملہ ہے، کیونکہ یہ دعاء کے آداب میں سے ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خصوصیت سے اس جگہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کیا، کہ شدید بڑھاپے کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء قبول فرما کر اولادِ صالح حضرت اسمٰعیل اور اسحٰق علیہما السلام عطا فرمائے۔

اس حمد و ثناء میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ بچہ جو بے یار و مددگار چٹیل میدان میں چھوڑا ہے آپ ہی کا عطیہ ہے، آپ ہی اس کی حفاظت فرمائیں گے، آخر میں حمد و ثناء کا تکملہ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ سے کیا گیا، یعنی بلاشبہ میرا پروردگار دعاؤں کا سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

اس حمد و ثناء کے بعد پھر دعاء میں مشغول ہو گئے، اور فرمایا: رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاۗءِ ۝ جس میں اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے نماز کی پابندی پر قائم رہنے کی دعاء کی، اور آخر میں پھر بطور الحاح کے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میری یہ دعاء قبول فرمائیے۔

آخر میں ایک جامع دعاء فرمائی رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ یعنی اے ہمارے پروردگار! میری اور میرے والدین کی اور تمام مومنین کی مغفرت فرما، اس دن جب کہ محشر میں تمام زندگی کے اعمال کا حساب لیا جائیگا اس میں والدین کے لئے بھی مغفرت کی دعاء فرمائی، حالانکہ والد یعنی آذر کا کافر ہونا قرآن میں مذکور ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ دعاء اُس وقت کی ہو جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کافروں کی سفارش اور دعائے مغفرت سے منع نہیں کیا گیا تھا، جیسے دوسری جگہ

قرآن کریم میں ہے وَاغْفِرْ لِاَبِیْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ ؀

احکام وہدایات آیاتِ مذکورہ سے دعاء کے آداب یہ معلوم ہوئے کہ بار بار الحاح وزاری کے ساتھ کی جائے، اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بھی کی جائے اس طرح دعاء کی قبولیت کی بڑی امید ہوجاتی ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ڛ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ

اور ہرگز مت خیال کر کہ اللہ بے خبر ہے اُن کاموں سے جو کرتے ہیں بے انصاف، ان کو تو ڈھیل دے رکھی

لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۝ ۴۲ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ

ہے اس دن کے لئے کہ پتھرا جائیں گی آنکھیں، دوڑتے ہوں گے اوپر اٹھائے اپنے سر

لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ۝ ۴۳ وَاَنْذِرِ

پھر کر نہیں آئیں گی ان کی طرف انکی آنکھیں، اور دل اُن کے اُڑ گئے ہوں گے، اور ڈرا دے

النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ

لوگوں کو اس دن سے کہ آئے گا ان پر عذاب تب کہیں گے ظالم اے رب ہمارے

اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۭ اَوَلَمْ

مہلت دے ہم کو تھوڑی مدت تک، کہ ہم قبول کرلیں تیرے بلانے کو اور پیروی کرلیں رسولوں کی کیا تم

تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۝ ۴۴ وَّسَكَنْتُمْ

پہلے قسم نہ کھاتے تھے کہ تم کو نہیں دنیا سے ٹلنا، اور آباد تھے تم

فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا

بستیوں میں انہی لوگوں کی جنھوں نے ظلم کیا اپنی جان پر اور کھل چکا تھا تم کو کہ کیسا کیا

بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ۝ ۴۵ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ

ہم نے اُن سے اور بتلائے ہم نے تم کو سب قصے، اور یہ بنا چکے ہیں اپنے داؤ اور

عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ۭ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۝ ۴۶

اللہ کے آگے ہے ان کا داؤ اور نہ ہوگا ان کا داؤ کہ ٹل جائیں اس سے پہاڑ،

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو

سو خیال مت کر کہ اللہ خلاف کریگا اپنا وعدہ اپنے رسولوں سے بیشک اللہ زبردست ہے

انْتِقَامٍ ۝ ۴۷ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَ

بدلہ لینے والا، جس دن بدلی جائے اس زمین سے اور زمین اور بدلے جائیں آسمان اور

بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ ۴۸ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ

لوگ نکل کھڑے ہوں سامنے اللہ اکیلے زبردست کے، اور دیکھے تو گنہگاروں کو اس دن

مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝ ۴۹ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى

باہم جکڑے ہوئے زنجیروں میں، کرتے اُن کے ہیں گندھک کے اور ڈھانکے لیتی

وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۝ ۵۰ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ

ہے ان کے منہ کو آگ، تاکہ بدلہ دے اللہ ہر ایک جی کو اس کی کمائی کا، بیشک

اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ ۵۱ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ

اللہ جلد کرنے والا ہے حساب، یہ خبر پہنچا دینی ہے لوگوں کو اور تاکہ چونک جائیں اس

وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ ۵۲

سے اور تاکہ جان لیں کہ معبود وہی ایک ہے اور تاکہ سوچ لیں عقل والے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے مخاطب) جو کچھ یہ ظالم (کافر) لوگ کر رہے ہیں اس سے خدا تعالیٰ کو (جلدی عذاب نہ دینے کی بنا پر) بے خبر مت سمجھ (کیونکہ) ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے جس میں ان لوگوں کی نگاہیں (مارے حیرت اور ہیبت کے) پھٹی رہ جاویں گی (اور وہ موقفِ حساب کی طرف حسب الطلب) دوڑتے ہوں گے (اور) ان کی نظر اُن کی طرف ہٹ کر نہ آوے گی (یعنی ایسی ٹکٹکی بندھے گی کہ آنکھ نہ جھپکیں گے) اور ان کے دل (شدتِ ہول سے) بالکل بدحواس ہوں گے اور (جب وہ دن آجائے گا پھر مہلت نہ ہوگی پس) آپ ان لوگوں کو اس دن (کے آنے) سے ڈرائیے جس دن ان پر عذاب آپڑے گا، پھر یہ ظالم لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ایک مدتِ قلیل تک ہم کو (اور) مہلت دیدیجئے (اور دنیا میں پھر بھیج دیجئے) ہم (اس مدت میں) آپ کا

سب کہنا مان لیں گے اور پیغمبروں کا اتباع کریں گے (جواب میں ارشاد ہوگا کہ کیا ہم نے دنیا میں تم کو مہلت طویلہ نہ دی تھی اور) کیا تم نے (اس مہلت کے طول ہی کے سبب) اس کے قبل (دنیا میں) قسمیں نہ کھائی تھیں کہ تم کو (دنیا سے) کہیں جانا ہی نہیں ہے (یعنی قیامت کے منکر تھے اور اس پر قسم کھاتے تھے، کقولہ تعالیٰ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ) حالانکہ (انکار سے باز آجانے کے اسباب سب مجتمع تھے چنانچہ) تم ان (پہلے) لوگوں کے رہنے کی جگہوں میں رہتے تھے جنھوں نے (کفر و انکارِ قیامت کرکے) اپنی ذات کا نقصان کیا تھا اور تم کو (تواترِ اخبار سے) یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیونکر معاملہ کیا تھا (کہ ان کے کفر و انکار پر ان کو سزائیں دیں، اس سے تم کو معلوم ہو سکتا تھا کہ انکار کرنا موجبِ غضب ہے، پس تصدیق واجب ہے، اور ان کے مساکن میں رہنا ہر وقت اُن کے ان حالات کی یاد دلانے کا سبب ہو سکتا تھا، پس انکار کی کسی وقت گنجائش نہ تھی) اور (علاوہ ان واقعات کے سننے کے جو کہ عبرت کے لئے کافی تھے) ہم نے (بھی) تم سے مثالیں بیان کیں (یعنی کتبِ سماویہ میں ہم نے بھی ان واقعات کو مثال کے طور پر بیان کیا کہ اگر تم ایسا کروگے تو تم بھی ایسے ہی مغضوب و مستحق عذاب ہوگے پس واقعات کا اولاً اخبار سے سننا پھر ہمارا ان کو بیان کرنا، پھر مماثلت پھر تنبیہ کر دینا یہ سب اسباب مقتضی اس کو تھے کہ قیامت کا انکار نہ کرتے) اور (ہم نے جن پہلے لوگوں کو ان کے کفر و انکار پر سزائیں دیں) ان لوگوں نے (دینِ حق کے مٹانے میں) اپنی سی بہت ہی بڑی بڑی تدبیریں کیں تھیں اور ان کی (یہ سب) تدبیریں اللہ کے سامنے تھیں (اس کے علم سے مخفی نہ رہ سکتی تھیں) اور واقعی ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ (عجب نہیں) ان سے پہاڑ بھی (اپنی جگہ سے) ٹل جاویں (مگر پھر بھی حق ہی غالب رہا اور ان کی ساری تدبیریں لغو و بیکار ہوگئیں اور وہ ہلاک کئے گئے، اس سے بھی معلوم ہوگیا کہ حق وہی ہے جو پیغمبر فرماتے تھے اور اس کا انکار موجبِ غضب و عذاب ہے، جب قیامت میں ان کا مغلوب ہونا معلوم ہوگیا) پس (اے مخاطب) اللہ تعالیٰ کو اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرنیوالا نہ سمجھنا، (چنانچہ قیامت کے دن ان کے منکرین کے عذاب کا وعدہ تھا سو وہ پورا ہوگا، جیسا اوپر مذکور ہوا) بیشک اللہ تعالیٰ بڑا زبردست (اور) پورا بدلہ لینے والا ہے (کہ اس کو کوئی بدلہ لینے سے نہیں روک سکتا، پس قدرت بھی کامل پھر مشیت کا تعلق اوپر معلوم ہوا، پھر خلفِ وعدہ کا کیا احتمال رہا اور یہ بدلہ اس روز ہوگا) جس روز دوسری زمین بدل جاوے گی اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی (دوسرے بدل دیئے جاویں گے ان آسمانوں کے علاوہ کیونکہ اول بار کے نفخِ صور سے سب زمین و آسمان ٹوٹ پھوٹ جاویں گے، پھر دوسری بار میں از سرِ نو زمین و آسمان بنیں گے)،

اور سب کے سب ایک (اور) زبردست اللہ کے روبرو پیش ہوں گے (مراد اس سے قیامت کا دن ہے یعنی قیامت میں بدلہ لیا جاوے گا) اور (اس روز اے مخاطب) تو مجرموں کو (یعنی کافروں کو) زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھے گا (اور) ان کے کُرتے قطران کے ہوں گے (یعنی سارے بدن کو قطران لپٹی ہوگی کہ اس میں آگ جلدی اور تیزی کے ساتھ لگے اور قطران درخت چیڑ کا روغن ہوتا ہے کمافی کتب اللغات والطب) اور آگ اُن کے چہروں پر (بھی) لپٹی ہوگی (یہ سب کچھ اس لئے ہوگا) تاکہ اللہ تعالیٰ ہر (مجرم) شخص کو اس کے کئے کی سزا دے (اور گو ایسے مجرم بے انتہا ہونگے مگر) یقیناً اللہ تعالیٰ (کو ان کا حساب و کتاب کچھ دشوار نہیں کیونکہ وہ) بڑی جلد حساب لینے والا ہے (سب کا فیصلہ شروع کرکے فوراً ہی ختم کردے گا) یہ (قرآن) لوگوں کے لئے احکام کا پہنچانا ہے (تاکہ مبلغ یعنی رسول کی تصدیق کریں) اور تاکہ اس کے ذریعہ سے (عذاب سے) ڈرائے جائیں اور تاکہ اس بات کا یقین کرلیں کہ وہی ایک معبود برحق ہے اور تاکہ دانشمند لوگ نصیحت حاصل کرلیں۔

معارف و مسائل

سورۂ ابراہیم میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے کچھ حالات و معاملات کی تفصیل اور احکام الٰہیہ کی مخالفت کرنے والوں کے انجام بد اور آخر میں حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ تھا، جنھوں نے بیت اللہ کی تعمیر کی، اور جن کی اولاد کے لئے اللہ تعالیٰ نے مکہ محترمہ کی بستی بسائی، اور اس کے بسنے والوں کو ہر طرح کا امن و امان اور غیر معمولی طور پر معاشی سہولتیں عطا فرمائیں، انہی کی اولاد بنی اسمٰعیل قرآن عظیم اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب اوّل ہیں۔

سورۂ ابراہیم کے اس آخری رکوع میں خلاصہ کے طور پر انہی اہل مکہ کو پچھلی قوموں کی سرگذشت سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین اور اب بھی ہوش میں نہ آنے کی صورت میں قیامت کے ہولناک عذابوں سے ڈرایا گیا ہے۔

پہلی آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر مظلوم کی تسلی اور ظالم کے لئے سخت عذاب کی دھمکی ہے کہ ظالم اور مجرم لوگ اللہ تعالیٰ کی ڈھیل دینے سے بے فکر نہ ہو جائیں، اور یہ نہ سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے جرائم کی خبر نہیں، اس لئے باوجود جرائم کے وہ پھل پھول رہے ہیں، کوئی عذاب و مصیبت ان پر نہیں آتی، بلکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں سب اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہے، مگر وہ اپنی رحمت اور حکمت کے تقاضے سے ڈھیل دے رہے ہیں۔

لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا، یعنی نہ سمجھو اللہ تعالیٰ کو غافل، یہ خطاب بظاہر ہر اُس

شخص کے لئے ہے جس کو اس کی غفلت اور شیطان نے اس دھوکہ میں ڈالا ہوا ہے، اور اگر اس کا مخاطب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں تو بھی مقصود اس سے امت کے غافلوں کو سنانا اور تنبیہ کرنا ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا امکان ہی نہیں کہ وہ معاذ اللہ اللہ تعالیٰ کو حالات سے بے خبر یا غافل سمجھیں۔

دوسری آیت میں بتلایا کہ ان ظالموں پر فوری طور سے عذاب نہ آنا ان کے لئے کچھ اچھا نہیں، کیونکہ اس کا انجام یہ ہے کہ یہ لوگ اچانک قیامت اور آخرت کے عذاب میں پکڑ لئے جائیں گے آگے ختم سورۃ تک اسی عذاب آخرت کی تفصیلات اور ہولناک وقائع کا بیان ہے۔

لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ، یعنی اس دن جبکہ پھٹی رہ جائیں گی آنکھیں" مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ "یعنی خوف وحیرت کے سبب سر اوپر اٹھائے ہوئے بے تحاشا دوڑ رہے ہوں گے" لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ "ان کی پلکیں نہ جھپکیں گی" وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَاۗءٌ، ان کے دل خالی بدحواس ہوں گے۔

یہ حالات بیان کرنے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ اپنی قوم کو اس دن کے عذاب سے ڈرائیے جس میں ظالم اور مجرم لوگ مجبور ہو کر پکاریں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں کچھ اور مہلت دیدیجئے یعنی پھر دنیا میں چند روز کے لئے بھیجدیجئے تاکہ ہم آپ کی دعوت قبول کرلیں اور آپ کے رسولوں کا اتباع کر کے اس عذاب سے نجات حاصل کرسکیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی درخواست کا یہ جواب ہوگا کہ اب تم یہ کہہ رہے ہو کیا تم نے اس سے پہلے یہ قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ ہماری دولت وشوکت کو زوال نہ ہوگا ہم ہمیشہ دنیا میں یونہی عیش وعشرت میں رہیں گے اور دوبارہ زندگی اور عالم آخرت کا انکار کیا تھا۔

وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ، ظاہر ہے کہ یہ خطاب مشرکین عرب کو ہے، جن کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے اَنْذِرِ النَّاسَ، یعنی ڈراؤ ان لوگوں کو، اس خطاب میں ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اقوام سابقہ کے حالات وانقلابات تمہارے لئے بہترین واعظ ہیں تعجب ہے کہ تم ان سے عبرت حاصل نہیں کرتے، حالانکہ تم انہی ہلاک شدہ قوموں کے گھروں میں بستے اور چلتے پھرتے ہو، اور تمہیں کچھ حالات کے مشاہدہ سے کچھ متواتر خبروں سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر کیسا سخت عذاب نازل کیا، اور ہم نے بھی تمہارے راہ پر لانے کے لئے بہت سی مثالیں بیان کیں، پھر بھی تم ہوش میں نہیں آتے۔

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ۭ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ، "یعنی ان لوگوں نے دین حق مٹانے اور دعوت حق قبول کرنے والے مسلمانوں کو ستانے اور ایذاء پہونچانے کے لئے بھرپور تدبیریں کیں، اور اللہ تعالیٰ کے پاس ان کی سب کھلی اور چھپی ہوئی تدبیریں سامنے موجود ہیں، وہ سب سے واقف اور ان کو ناکام بنادینے پر قادر ہیں، اگرچہ ان کی تدبیریں ایسی عظیم اور سخت تھیں کہ ان کے مقابلہ پر پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں، مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ ساری تدبیریں گرد اور ناکام ہو کر رہ گئیں۔

جن مخالفانہ تدبیروں کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد پچھلی ہلاک شدہ قوموں کی تدبیریں ہوں، مثلاً نمرود، فرعون، قوم عاد وثمود وغیرہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں موجودہ مشرکین عرب کا حال بیان کیا گیا ہو کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بڑی گہری اور دور رس سازشیں اور تدبیریں کیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ناکام بنادیا۔

اور اکثر مفسرین نے وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ میں لفظ اِنْ کو حرف نفی قرار دے کر یہ معنی کئے ہیں کہ اگرچہ انہوں نے بہت سی تدبیریں کیں اور چالیں چلیں، لیکن ان کی تدبیروں اور چالوں سے یہ ممکن نہ تھا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں، اور پہاڑ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کا عزم واستقلال ہے کہ کفار کی کوئی چال اس پر اثر انداز نہیں ہوسکی۔

اس کے بعد امت محمدیہ کو سنانے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بظاہر مخاطب کر کے یہ تنبیہ کی گئی، فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ "یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے جو وعدے فتح ونصرت اور کامیابی کے کئے ہیں وہ ان کے خلاف کرے گا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست اور انتقام لینے والا ہے، وہ ضرور اپنے پیغمبروں کے دشمنوں سے انتقام لے گا، اور پیغمبروں سے جو وعدے کئے ان کو پورا کرے گا۔

اس کے بعد کی آیات میں پھر قیامت کے ہولناک حالات وواقعات کا ذکر ہے، ارشاد فرمایا، يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ، "یعنی قیامت کا دن ایسا ہوگا کہ اس میں موجودہ زمین بھی بدل دی جائے گی، اور آسمان بھی اور سب کے سب اللہ واحد وقہار کے سامنے حاضر ہوں گے"

زمین وآسمان کے بدل دینے کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ان کی صفات اور شکل وصورت بدل دی جائے، جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات اور روایات حدیث میں ہے کہ پوری زمین ایک سطح مستوی بنادی جائے گی، جس میں نہ کسی مکان کی آڑ ہوگی، نہ درخت وغیرہ کی، نہ کوئی پہاڑ اور ٹیلہ رہے گا نہ غار اور گہرائی، قرآن کریم میں اسی حال کا ذکر اس طرح فرمایا ہے

لَا تَرٰی فِیْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا، یعنی تعمیرات اور پہاڑوں کی وجہ سے جو آجکل راستے اور سڑکیں مڑ کر گذرتی ہیں، اور کہیں اونچائی ہے کہیں گہرائی، یہ صورت نہ رہے گی بلکہ سب صاف میدان ہو جائے گا۔

اور تبدیلِ زمین و آسمان کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بالکل ہی اس زمین کے بدلے میں دوسری زمین اور اس آسمان کی جگہ دوسرے آسمان بنا دیئے جائیں، روایاتِ حدیث جو اس کے متعلق منقول ہیں ان میں بھی بعض سے صرف صفات کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے بعض سے ذات کی تبدیلی

امام حدیث بیہقی نے بسند صحیح حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے اس آیت کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر کی زمین بالکل نئی زمین چاندی کی طرح سفید ہو گی اور یہ زمین ایسی ہو گی جس پر کسی نے کوئی گناہ نہیں کیا ہو گا جس پر کسی کا ناحق خون نہیں گرایا گیا، اسی طرح مسند احمد اور تفسیر ابن جریر کی حدیث میں یہی مضمون بروایت حضرت انسؓ مذکور ہے (تفسیر مظہری)

صحیحین بخاری و مسلم میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ ایک ایسی زمین پر اٹھائے جائیں گے جو ایسی صاف و سفید ہو گی جیسے میدے کی روٹی، اس میں کسی کی کوئی علامت (مکان، باغ، درخت، پہاڑ، ٹیلہ وغیرہ کی) کچھ نہ ہو گی، یہی مضمون بیہقی نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

اور حاکم نے سند قوی کے ساتھ حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز یہ زمین اس طرح کھینچی جائے گی، جیسے چمڑے کو کھینچا جائے جس سے اس کی سلوٹیں اور شکن نکل جائیں (اس کی وجہ سے زمین کے غار اور پہاڑ سب برابر ہو کر ایک سطح مستوی بن جائے گی، اور اس وقت تمام اولادِ آدم اس زمین پر جمع ہو گی، اس ہجوم کی وجہ سے ایک انسان کے حصہ میں صرف اتنی ہی زمین ہو گی جس پر وہ کھڑا ہو سکے، پھر محشر میں سب سے پہلے مجھے بلایا جائے گا، میں ربّ العزت کے سامنے سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر مجھے شفاعت کی اجازت دی جائے گی تو میں تمام مخلوق کے لئے شفاعت کروں گا، کہ ان کا حساب کتاب جلد ہو جائے۔

اس آخری روایت سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں تبدیلی صرف صفت کی ہو گی کہ غار اور پہاڑ اور عمارت اور درخت نہ رہیں گے، مگر ذاتِ زمین یہی باقی رہے گی، اور پہلی سب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر کی زمین اس موجودہ زمین کے علاوہ کوئی اور ہو گی، اور جس تبدیلی کا ذکر اس آیت میں ہے اس سے ذات کی تبدیلی مراد ہے۔

تبیان القرآن میں حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں، ہو سکتا ہے پہلے نفخۂ صور کے وقت اسی موجودہ زمین کی صفات تبدیل کی جائیں، اور پھر حساب کتاب کے لئے ان کو کسی دوسری زمین کی طرف منتقل کیا جائے۔

تفسیر مظہری میں مسند عبد ابن حمید سے حضرت عکرمہؓ کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے، اس کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ زمین سمٹ جائے گی اور اس کے پہلو میں ایک دوسری زمین ہو گی جس پر لوگوں کو حساب کتاب کے لئے کھڑا کیا جائے گا۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ثوبانؓ منقول ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک یہودی عالم آیا اور یہ سوال کیا کہ جس دن یہ زمین بدلی جاوے گی تو آدمی کہاں ہوں گے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ پل صراط کے پاس ایک اندھیری میں ہوں گے۔

اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمین سے بذریعہ پل صراط دوسری طرف منتقل کئے جائیں گے، اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں متعدد صحابہ و تابعین کے یہ اقوال نقل کئے ہیں کہ اس وقت موجودہ زمین اور اس کے سب دریا آگ ہو جائیں گے، گویا یہ سارا علاقہ جس میں اب دنیا آباد ہے اس وقت جہنم کا علاقہ ہو جائے گا، اور حقیقتِ حال اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، بندہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ؎

زباں تازہ کردن باقرارِ تو ؛ نینگیختن علت از کارِ تو

آخری آیات میں اہلِ جہنم کا یہ حال بتلایا گیا ہے کہ مجرم لوگوں کو ایک زنجیر میں باندھ دیا جائے گا، یعنی ہر جرم کے مجرم الگ الگ جمع کر کے یک جا باندھ دیئے جائیں گے، اور ان کو جو لباس پہنایا جائے گا وہ قطران کا ہو گا جس کو تارکول کہا جاتا ہے، اور وہ ایک آتش گیر مادہ ہے کہ آگ فوراً پکڑ لیتا ہے۔

آخری آیت میں ارشاد فرمایا کہ یہ سب احوالِ قیامت کا بیان کرنا لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لئے ہے، تاکہ وہ اب بھی سمجھ لیں کہ قابلِ عبادت و اطاعت صرف ایک ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، اور تاکہ جن میں کچھ بھی عقل و ہوش ہے وہ شرک سے باز آجائیں۔

سورۂ ابراہیم ختم شد

ایک یادداشت اور اطلاع

احقر ناکارہ نہ اس کا اہل تھا کہ تفسیر قرآن لکھنے کی جرأت کرے، نہ کبھی اس خیال کی ہمت کرتا تھا البتہ اپنے مرشد حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن کو جو اس زمانہ کی بے نظیر متوسط تفسیر ہے نہ بہت مختصر کہ مضمونِ قرآن سمجھنا مشکل ہو نہ بہت طویل کہ پڑھنا مشکل ہو، پھر خداداد علم و ذکاوت اور تقویٰ و طہارت کی برکت سے اقوالِ مختلفہ میں ایک کو ترجیح دے کر لکھ دینے کا جو خاص ذوق حق تعالیٰ نے موصوف کو عطا فرمایا تھا وہ بڑی تفسیروں سے بھی حاصل ہونا مشکل تھا، مگر یہ تفسیر حضرتؒ نے اہلِ علم کے لئے انہی کی زبان اور علمی اصطلاحوں میں لکھی ہے، عوام خصوصاً اس زمانہ کے عوام جو عربی زبان اور اس کی اصطلاحات سے بہت دور ہو چکے ہیں ان کو اس تفسیر سے استفادہ مشکل تھا۔

اس لئے یہ خیال اکثر رہا کرتا تھا کہ اس کے مضامین عجیبہ کو آجکل کی آسان زبان میں لکھا جائے مگر یہ بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔

بحکمِ قضاء و قدر اس کی ابتداء اس طرح ہو گئی کہ ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر صاحب نے مجھ پر اصرار کیا کہ ریڈیو پر ایک سلسلہ قرآن کی خاص خاص آیات کا بعنوان "معارف القرآن" جاری کیا جائے ان کا اصرار اس کام کے آغاز کا سبب بن گیا، اور ریڈیو پاکستان پر ہر جمعہ کے روز جمعہ ۳ شوال ۱۳۷۳ھ مطابق ۲ جولائی ۱۹۵۴ء سے شروع ہو کر ۱۵ صفر ۱۳۸۴ھ مطابق ۲۵ جون ۱۹۶۴ء تک جاری رہا، جو سورۂ ابراہیم کے اختتام پر منجانب محکمۂ ریڈیو پاکستان ختم کر دیا گیا۔

حق تعالیٰ نے اس کو میرے وہم و گمان سے زیادہ مقبولیت عطا فرمائی، اور اطرافِ عالم سے اس کو کتابی صورت میں طبع کرنے کا تقاضا ہوا، اس کا ارادہ کیا تو جتنا کام اس وقت تک ہو چکا تھا وہ بھی اس لحاظ سے ناتمام تھا کہ یہ سلسلہ منتخب آیات کا تھا، درمیانی آیات کو جو خالص علمی تھیں ریڈیو پر عوام کو ان کی تفسیر سمجھانا آسان نہ تھا، وہ رہ گئی تھیں، کتابی شکل میں طبع کرنے کے لئے ان کا سلسلہ بھی پورا کرنا تھا، جو بوجہ وقتی مشاغل کے پورا کرنا مشکل تھا۔

عجائبِ قدرت سے ہے کہ رمضان ۱۳۸۸ھ میں احقر سخت بیمار ہو کر نقل و حرکت سے معذور صاحبِ فراش ہو گیا، اور موت سامنے محسوس ہونے لگی، تو اس کا افسوس ستانے لگا کہ یہ مسودات یوں ہی ضائع ہو جائیں گے، حق تعالیٰ نے دل میں یہ داعیہ پیدا فرما دیا کہ لیٹے بیٹھے "معارف القرآن" کے مسودات پر نظرِ ثانی اور درمیانی آیات جو رہ گئی ہیں ان کی تکمیل کسی طرح اسی حالت میں کر دی جائے۔

ادھر بیماری کا سلسلہ طویل ہوتا چلا گیا، بیماری نے تمام دوسرے مشاغل پہلے ہی چھڑا دیئے تھے، اب صرف یہی مشغلہ رہ گیا، اس لئے قدرت کے عجیب و غریب انتظام نے اسی بیماری میں بحمداللہ یہ کام ۲۹ رجب ۱۳۹۰ھ تک پورا کرا دیا۔

یہاں تک کہ سورۂ ابراہیم کا ختم اور قرآن پاک کے تیرہ پارے اسی ریڈیو کی نشری دروس کے ذریعہ پورے ہو گئے۔

اب اللہ تعالیٰ نے اگلے حصہ کے لکھنے کی توفیق و ہمت بھی عطا فرمادی، نقل و حرکت سے معذوری کی تکلیف بھی رفع فرمادی، اگرچہ سلسلہ مختلف امراض کا تقریباً مسلسل رہا اور ضعف بھی بڑھتا رہا، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اسی کی امداد سے ۳۰ رشعبان ۱۳۹۰ھ سے قرآن کے اگلے پاروں کی تفسیر کا لکھنا شروع ہو کر اس وقت جبکہ "معارف القرآن" کی تین جلدیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، یعنی ۲۵ رصفر ۱۳۹۱ھ میں اس تفسیر کا مسودہ قرآن کریم کی چوتھی منزل سورۂ فرقان آنیسویں پارے تک بعون اللہ سبحانہٗ مکمل ہو چکا ہے۔

اس وقت بھی مختلف امراض اور ضعف کا سلسلہ بھی ہے، اور بحمداللہ یہ کام بھی جاری ہے، کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمادیں۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

بندہ محمد شفیع

۲۵ صفر ۱۳۹۱ھ